نیا ادب میری نظر میں

مرتبہ

آغا سرخوش قزلباش

ہندستانی پبلشرز دلی

طبع اوّل
سنہ ۱۹۴۴ء

قیمت دو روپے

سول ایجنٹس
نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی
ادارۂ ہندستانی پبلشرز دہلی نے جناح پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا
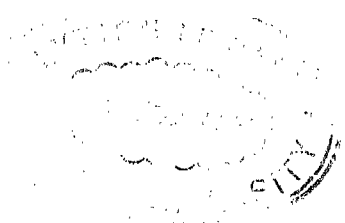
نیا ادب میری نظر میں

لکھنے والے

میرا مدّعا

یہ تھا کہ نئے اور پرانے ادب کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی ہے وہ اس کوشش کے ذریعہ پاٹ دی جائے اور موجودہ دور کی ایک ایسی ملی جلی ادبی تاریخ باقی رہ جائے جو ہمارے خیالات، حالات، اور کشمکش حیات کا ایک ایسا نقش ہو جسے دیکھنے والے صاف و مشرح سمجھ سکیں نئے ادب کی کم و بیش تمام خوبیاں اور برائیاں ایک جگہ جمع کر دی جائیں اسی طرح پرانے ادب کے معائب و محاسن بھی گنوا دیئے جائیں جنہیں ملک کے سوچنے سمجھنے والے دماغوں نے اپنے اپنے نظریوں سے چھان پھٹک کر اکٹھا کیا ہو۔

"نیا ادب میری نظر میں" اسی آرزو کی عملی تصویر ہے، کچھ حضرات نہ معلوم کیوں اپنا دامن بچا گئے، کچھ حضرات خاموش ہو کر رہ گئے مگر سب سے بڑا دھکا اس جد و جہد میں مولانا عبدالحق صاحب کی مصروفیت سے پہونچا۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ جب سب مضامین چھپ جائیں تو میں انکو پڑھوں گا۔ اور ان سب پر ریویو کرونگا، لیکن مولانا کی مصروفیت نے ایسا نہیں ہونے دیا جس کی وجہ سے ترتیب میں بھی نظم نہ رہا اور ایک بڑا تحقیقی عنصر بھی کم ہو گیا بہر صورت میں تمام کرم فرماؤں کا ممنون ہوں جنہوں نے اپنی آرا سے اس کتاب کو مشعل راہ بنایا۔

کاپیاں اور پروف پڑھتے پڑھتے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کتاب سے پہلے "تنقید کیا ہے" کے نام سے ایک کتاب شائع کر لی جاتی تھی کیونکہ بقول جوش ملیح آبادی۔

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

ابھی ہمارے ادب میں تنقید کی مسیں بھی نہیں بھیگی ہیں بلکہ گھٹنیوں چل رہی ہے۔ اور اس عمر کے بچے کو اتنا بڑا سوال حل کرنے کے لئے دیدینا قرینِ عقل بھی نہیں تھا۔ دو تین مضامین مجھے ایسے ناتوان اور بے روح نظر آئے جن کی وجہ سے چاہتا ہوں کہ جلد از جلد "تنقید کیا ہے" پیش کر سکوں۔ "دیکھئے ہو کب تلک تعبیر خواب"! آغا سرخوش

نیا ادب میری نظر میں

(مولانا) عبدالحق

اس دنیا میں کوئی شے اپنے حال پر نہیں رہتی کائنات کی ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ ہر شے بدلتی بگڑتی بنتی رہتی ہے۔ اپنے ہی زمانے کو دیکھئے، رہنے سہنے، کھانے، پینے، تعلیم، سیاست حرفت وصنعت، خیالات میں کس قدر تغیر ہو گیا ہے۔ ادب اس سے کیوں کر بچ سکتا تھا۔ لیکن اسے "جدید" کہہ کر ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت تھی یہ تو پھر بھی جدید ہی رہتا۔ جسے ہم پرانا کہتے ہیں وہ بھی تو کبھی جدید تھا اور آج جو جدید ہے ایک دن پرانا ہو کر رہے گا۔ نیا کتنا ہی نیا کیوں نہ ہو، پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ پرانا عنصر ہوتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ نئے ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر پرانی چیز کو نفرت سے دیکھا جائے

اس وقت جو نیا ادب کہلاتا ہے اس کے لکھنے والے مختلف مزاج اور خیالات کے لوگ ہیں۔ اکثر فرائڈ، مارکس اور روسی نظام سے متاثر ہیں اور یہ کیا ایک دنیا متاثر ہے۔ لیکن کم ایسے ہیں جنہوں نے ان تینوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو۔ تقلید، اخذ، توارد زیادہ ہے۔ آغاز میں یہ ہونا لازم تھا۔ جدت بھی ہے مگر کم۔ بعض تحریریں اور فسانے وغیرہ ان کے قلم سے ایسے نکلے ہیں جن سے مانے ہوئے قدیم اخلاق اور اصولوں پر ضرب پڑتی ہے اسلئے لوگ عام طور پر ان نو ادیبوں سے بیزار معلوم ہوتے ہیں یہ پیرایۂ بیان کا قصور ہے اور پیرایہ بیان کا ادب میں بڑا درجہ ہے اس کے لئے انھیں اپنے ادب کا بڑے

غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ جب تک زبان پر قدرت نہ ہوگی اور اظہار کے اچھے ڈھنگ ہاتھ نہ آئیں گے۔ خیال کیسا ہی اچھا ہو، پڑھنے والوں کو نہیں لبھا سکتا۔ بھونڈا پن ادب میں جرم ہے۔ انھیں اتنی بات تو ضرور خیال میں رکھنی چاہیے کہ جب وہ موجودہ معاشرت کی خرابیاں ظاہر کرنا اور خیالات میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنا منشا ایسے سلیقے اور حسن سے ادا کریں کہ سب نہیں تو کچھ تو ضرور اس کا اثر قبول کریں۔ خیالات کا اظہار دل آزاری کی نظر سے نہیں، اصلاح کی غرض سے ہونا چاہیے لیکن انصاف شرط ہے۔ نئے لکھنے والوں نے بعض ایسی نظمیں اور فسانے لکھے ہیں جو اردو ادب میں بہت قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔

میں نے نئے ادیبوں کی کچھ تحریریں پڑھی ہیں۔ بعض مجھے بھی ناگوار گذریں لیکن میں ناخوش اور ناراض نہیں ہوا۔ ان میں کچھ خامیاں اور بے باکیاں ہیں (اور یہ کب نہیں تھیں)، مگر خوبیاں بھی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں جرأت ہے اور ان کی بات میں جان ہے۔ علم و فضل ہو، زبان پر پوری قدرت بھی ہو۔ الفاظ اور محاورات کی تحقیق میں بھی کمال حاصل ہو، مگر کلام میں جان نہ ہو تو وہ ادب نہیں۔ رہی خامیاں اور بے باکیاں، سو یہ کچھ تو جوانی کی ترنگ اور نیا نیا جوش ہے۔ کچھ زمانے اور ماحول کا تقاضا اور کچھ اپنے ادب اور

اس کی تاریخ سے بے خبری۔ مجھے یقین ہے کہ جب ان کا مطالعہ اپنے ادب
اور اپنے اہلِ وطن کا زیادہ وسیع ہوگا۔ جب وہ اپنے سوچے ہوئے خیالات
اور اپنے پر بیتے ہوئے حالات اور تجربات کو اچھے پیرایہ میں بیان کرینگے
تو اس وقت جو نیا ادب پیدا ہوگا وہ ہماری زبان میں بڑی قدر و قعت
کے قابل ہوگا۔ نئے ادیبوں میں بعض بہت ہونہار، نہایت ذہین اور
جدت پسند ہیں اور اردو ادب کو ان سے بہت بڑی توقعات ہیں۔

نیا ادب میری نظر میں

جعفر علی خاں اثرؔ

(نوٹ) :- ادب اور زندگی دونوں سے ناآشنا تاہم "ادب برائے زندگی" کا راگ الاپنے والے کہتے ہیں کہ زندگی فطرتاً روپ بدلنے پر مجبور ہے اور چاہتی ہے کہ ہر روپ پہلے سے زیادہ حسین اور قوی ہو، اس کے لئے تنقیص اور تخریب ضروری ہے ورنہ تعمیر ناممکن ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک بربادیوں کی تکمیل اور دنیا کو حسین و قوی تر بنانے کا سہل نسخہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں کو مٹا کر عنانِ اختیار مزدور کے ہاتھ میں دیدی جائے، یہ لوگ تاریخ پر زور دیتے ہیں حالانکہ تاریخ اور واقعاتِ حاضرہ سے اس قول کا کھوکھلا پن ثابت ہے اور تقریباً جتنے سربرآوردہ مفکر ہیں ان کا گمان ہے کہ سماج کی حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی جب تک مشینیں اور سائنس کی مادی دنیا محبت اور روحانیت کے تابع ترقی نہ کرے گی، مزدور اور سرمایہ دار، کسان اور زمیندار کی آویزش بھی قدروں کے عدمِ توازن کا نتیجہ ہے۔ تعمیر کی تدبیر سوچے بغیر تخریب کا ارتکاب بالکل ایسا ہے کہ بندر کو تلوار تھما کر آزاد چھوڑ دیا جائے!

روئے سخن صرف ان خام کاروں کی طرف ہے جو "ادب برائے زندگی" کے پردے میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اخلاق و اطوار، شرم و حیا

سے بیگانہ ہو کر کھُل کھیلنے کی تعلیم دیتے اور بہیمیت کی پستیوں کی طرف لے
جانا چاہتے ہیں ورنہ "ادب برائے ادب" یا "ادب برائے زندگی" کی
اصولی بحث مدت سے قایم ہے اور رہے گی۔
آثر

جب تک ادب کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہے اس سے صناعت کا عنصر جدا نہیں کیا جا سکتا اور یہ شامل ہے تو شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو (ہماری بحث شاعری تک محدود رہے گی) اس کا مقصد اولیں نشاط دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، ادب کا افادی یا غیر افادی ہونا ضمنی اور اضافی اوصاف ہیں اسی طرح تمدن، سیاست یا کسی اور تحریک سے ادب کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ موجودات عالم میں کوئی شے اور واقعہ ایسا نہیں جو شاعری کے دائرۂ عمل سے خارج ہو، مگر نقطۂ نظر صناعانہ اور پروپیگنڈا کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیئے ورنہ شاعری یا ادب کا غلط اور ناجائز استعمال ہوا۔ موضوع جو کچھ ہو طرز ادا میں فن کارانہ بانکپن قایم رہے۔ ادب کو جہاں کسی غرض یا مفاد کا آلۂ کار بنایا اس کی تاثیر اور دلکشی فنا ہوئی۔ پھر شاعری شاعری نہیں بکواس ہے۔

فنون لطیفہ میں مصوری، موسیقی اور بت تراشی بھی شامل ہیں، ان سے پروپیگنڈا کا کام نہیں لیا جاتا مگر غریب شاعری سے توقع رکھی جاتی ہے کہ مزدوروں، کسانوں اور عصابی تناؤ میں گرفتار نوجوانوں کی دلّالی کرے۔

اگر شاعری کا مقصود زندگی کی مستقل قدروں کا دریافت کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ہے تو ایسی نام نہاد شاعری کا انجام کیا ہوگا جو ایک خاص مطلب کے حصول کے لئے گتھیوں کو سلجھانے اور مسائل کا واقعات کی روشنی میں حل سوچے بغیر ہندوستان میں سوویٹ ذہنیت پھیلانا چاہتی ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کی بڑھتی ہوئی پیاس میں جذبۂ نفرت و انتقام بھی کارفرما ہے تو ایسی شاعری کی زبونی کا کیا پوچھنا

ان لوگوں کا مفروضہ "ادب برائے زندگی" دراصل روسی اشتراکی لٹریچر کا بگڑا ہوا خاکہ ہے جسے خود روس پچاس برس پیچھے چھوڑ گیا۔ ایسی شاعری کیا خاک کامیاب ہو سکتی ہے جس میں خلاقانہ تمکین معدوم ہے اور جس میں حقائق کی ترجمانی کے بجائے فرسودہ بدیسی تحریکات کو ہندوستان میں منتقل کر کے ان کی مبالغہ آمیز اور سفیہانہ نقالی کی گئی ہے۔ وہ بھی محض الفاظ میں امید ان عمل میں ان کے دشمن بے شک ہیں۔ یہ ایسی شاعری ہے جو کسی خاص مقصد کی تکمیل اور اظہار کو وجود میں آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہے، اس کے اچھالنے والے چند گم کردہ مدعا، برخود غلط نوجوان ہیں اور بس۔

درست ہے کہ ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی شاعری کو حیات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، فرق صرف زاویہ نگاہ کا ہے۔ ادب برائے ادب میں صناعت کا پہلو نمایاں رہتا ہے گو موضوع زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے وابستہ ہوتا ہے۔ ادب برائے زندگی میں زندگی کا وہ پہلو اجاگر ہوتا ہے جس پر شاعرانہ لطافتوں کو لئے ہوئے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ ہو یا وہ ہو شاعری کا منشا یہی ٹھہرا کہ حیات و کائنات کی تفسیر و تنقید کرے مگر ایسی زبان میں اور اس اسلوب سے کہ یہ تفسیر یا تنقید اپنے حسن و لطافت سے دل و دماغ کے سے تسکین یا راحت کا موجب ہو (لفظ تسکین غم اور خوشی دونوں پر حاوی ہے) اسی سے ہم کہتے ہیں کہ ادب کا مقصود بالذات دماغی اور روحانی مسرت یا تسکین مہیا کرنے کے سوا کچھ نہیں اور "ادب برائے زندگی" جو اس مقصد سے ہٹ کر شاعری کو اس کی بلندیوں اور لطافتوں سے محروم کر کے کثافت اور گندگی میں آلودہ کرنا چاہتا ہے۔ تو حیات کی تفسیر ہے نہ ترجمانی۔

دوبارہ اس امر کے اعادہ کی ضرورت ہے کہ شاعری کے دائرۂ عمل سے

کوئی واقعہ خارج نہیں۔ شاعر اگر دراصل شاعر ہے تو اس کا موضوعِ سخن جو کچھ بھی ہو زندگی کی تنقید یا ترجمانی ضرور ہوگی، کیونکہ موجودات و محسوسات میں کوئی شے ایسی نہیں جو زندگی سے وابستہ نہ ہو اور یہ تنقید یا تفسیر ایسے الفاظ میں اور اس انداز سے ہوگی کہ اُس میں شاعرانہ حسن و صداقت جھلکیں گے۔ یہی وصف شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور شاعری کو اظہارِ جذبات و خیالات کے دوسرے طریقوں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے مگر جو لوگ حیا سوز فحاشی اور خواہشاتِ جنسی میں ہیجان پیدا کرنے والی باتوں ہی کو شاعری سمجھتے ہوں اُن کو سمجھانے کی کوشش ہی پاگل پن ہے۔ خیر ع

"تھا جنونِ عشق کا یہ بھی تقاضہ، ہو گیا"

ادب برائے زندگی کے علمبردار ادب برائے ادب کا یہ مفہوم متعین کرتے ہیں کہ اس کا مقصدِ واحد سامانِ تفریح مہیا کرنا ہے۔ اگر تفریح سے مراد ادب کی دل آویزی ہے، وہ رعنائیاں اور رنگینیاں ہیں جن میں ہم گم ہو جاتے ہیں تو بے شک ایسا ادب سامانِ تفریح ہے اور ہمیں شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر حقیقی ادب کی دستگاہ یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اچھا ادب نہ صرف حیات کا ترجمان ہوتا ہے بلکہ دائرۂ حیات کو وسیع کرتے کرتے بظاہر بے جان اشیاء میں بھی حیات کا مشاہدہ کرتا ہوا انسان کو نامحدودیت سے ہم کنار کر دیتا ہے، یہاں تک کہ خود موت بھی زندگی کی ایک شکل بن جاتی ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہمارے ادب میں رومانیت اور قنوطیت کے سوا کچھ نہیں تخیل کے علاوہ طرزِ ادا اور بیان کی خوبی وہ زیور ہیں جن سے عروسِ سخن سنواری جاتی ہے انھیں کو مقصود بالذات کہنا صریحی بہتان ہے (گفتگو اچھے کلام سے ہے ورنہ رطب

زیبائش ہر جگہ ہے) البتہ مدعیانِ ادب برائے زندگی ادھوری محاکات اور مبہم
معانی کا بے ڈھنگا ڈھانچا تیار کر کے اُس کو زرق برق لباس پہنا کر دعوتِ نگاہ دیتے
ہیں۔ ؎

اینست کہ دل بردہ و خوں کردہ بسے را
بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را

مگر یہ ناظورۂ ہزار شیوہ دراصل عفونت میں بسا ہوا اور غلاظت میں لتھڑا ہوا چھلاوا
ثابت ہوتی ہے جس کی کراہت لیپ پوت نے دوبالا کر دی۔

ادب برائے زندگی کے مدعیوں کا بیان ہے کہ اُن کے مخالفین زندگی کی
تلخیوں اور ناکامیوں سے بھاگ کر ایک فرضی اور مصنوعی دنیا میں پناہ لیتے ہیں الفاظ
میں موسیقیت اور خیالات میں رومانیت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ درانحالیکہ زیرِ
نظر ادب برائے زندگی کا وجود ہی کالعدم ہو جاتا ہے اگر زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں
نے خود ان معترضین کی شکست خوردہ ذہنیت کو شاعری پر نہیں ابھارا۔ یہ احساس
بیچارگی و محرومی ہی تو ہے جو قوتِ عمل نہ ہونے کے باعث نثر میں کوسنے اور
گالیاں اور نظم میں "ماری جور ہنیا" بن گیا، لگے ہاتھوں پیٹ پالنے کا دھندا بھی۔ بس
یہی تلخی اور ناکامی ہے جس نے ان کی شاعری کو مسلخ کا نمونہ بنا دیا ہے، اس میں
سوائے دانت پیسنے، چیخنے چلانے، بوٹیاں نوچنے خون بہانے اور ڈکارنے کے
کچھ نہیں۔ ان کی شاعری میں توپ تفنگ لاشوں کے ڈھیر اور خون کی ندیوں کے
باوجود مردانگی اور دلیری کی ڈپٹ نہیں، بڑبڑانا رونا پیٹنا اور خواب میں بڑانا ہے،
سمندر کا جزر و مد اور اس کا طوفانی اضطراب مفقود ہے۔

شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو جب تک اُس کی امتیازی شان موجود نہ ہو گی
تاثیر اور کیف سے خالی رہے گی۔ راستی، حُسن اور شدّتِ احساس اس کے اجزا
نفسہ ہیں۔ اختراع و انتخاب و ترتیب اس کے آلۂ کار اور موسیقی و سنوری و تنوع

اس کے رفیق ہیں، راستی سے یہ مراد نہیں کہ درخت کو درخت کہہ دیا بلکہ جو نقش ابھرے وہ کامل اور بے عیب ہو، حُسن سے یہ مدّعا نہیں کہ کسی "مہ جبین" کو دیکھ لیا اور ریجھ گئے بلکہ وہ توازن وتناسب خیال ومعنی ہے جس سے ایسا روحانی اہتزاز حاصل ہوتا ہے جو انسان کو "پوتر" بنادے۔

یہ لوگ مدعی تو ہیں ادب برائے زندگی کے مگر زندگی کے حلقے سے ہر شے کو سوائے چند "مفید" عنوانات کے خارج کر دیا ہے، ان کی شاعری انسان کو حقیقت کا راز دار اور فطرت کا ترجمان بنانے کے بجائے انقلاب کے سامنے ناچنے تھرکنے یا نجاست میں لوٹنے کی دعوت دیتی ہے، شاعری عشقیہ ہو یا غیر عشقیہ جسدِ بے روح ہے اگر حقیقت سے دور، جوش وخروش سے خالی اور تصنع سے پُر ہے۔

ادب برائے زندگی کے موئدجنھیں روسی ادب جدید سے زیادہ غالباً میتھو آرنلڈ کے اس مقولے نے کہ "شاعری تنقید حیات ہے" گمراہ کر دیا ہے صرف اسی شاعری کے گرویدہ ہیں جو اشتراکیت، انقلاب، اور بدکاری کی تلقین کرے۔ حالانکہ میتھو آرنلڈ نے جہاں شاعری (بلکہ ادب) کو تنقید حیات کہا ہے یہ شرط لگادی ہے کہ تنقید حیات قوانین حسن وصداقت کے ماتحت ہونا چاہئے ایک جگہ کہتا ہے کہ

> "ہمارا فرض ہے کہ شاعری کو زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھیں اور زیادہ بلند رتبہ دیں ...... زندگی کی ترجمانی کے لئے شاعری کی طرف رجوع ناگزیر ہے، شاعری ہی سے تسکین اور تقویت حاصل کرنا ہوگی، شاعری کے بغیر سائنس نامکمل نظر آئے گا اور ایک بڑا حصہ ہمارے علم کا جس کو مذہب یا فلسفہ سے تعبیر کیا جاتا

ہے اُس کی جگہ شاعری لے لیگی جو دراصل تمام علوم کا نچوڑ
بلکہ روحِ رواں ہے"

ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے کہ "مذہب کا راسخ ترین جزو اس کی نامحسوس شعریت ہے"

ان اقوال کی روشنی میں "ترقی پسند" ادیبوں کی نظمیں پڑھی جائیں تو ایسی باتوں کا شائبہ بھی نہ ملے گا جنھیں شاعری کے بلند اور مقدس مقاصد سے دُور کا بھی لگاؤ ہو، اُس میں ایسی اعلےٰ صداقت کا نام نہیں جو سطحی نگاہوں سے مخفی ہو اور جس کا اکتشاف شاعر کا فرضِ اولیں ہے، متانت کا ذکر ہی بے کار ہے اُس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ تاہم یہ لوگ میتھو آرنلڈ کے قول کو اپنا دستور العمل بتانے کے مدعی ہیں اور کتابوں اور مضامین کا ایک پورا بوجھ اپنی بے باک گمراہی کی تائید میں لکھ مارا ہے، تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ ہماری شاعری حیات کی سچی تنقید اور ترجمانی ہے جس نے شاعری کو خیالی پلاؤ پکانے کے بجائے حقائق حیات سے قریب تر کر دیا ہے، اگر تنقید حیات کا مفہوم میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں حقیقی حسن و صداقت کو بے نقاب کرنا ہے تو اس جماعت نے اس "شاہدِ معنی" کا ایک جلوۂ رعنا بھی آشکار نہیں کیا۔ اگر شاعری کا فرض وہ عظیم الشان اصول منضبط کرنا ہے جو انسان کو ایسا سکون، واطمینان وانبساط بخشیں جس کی تکمیل کو مذہب اور سائنس ناکافی ہیں، جو مذہب کی آنکھوں کا نور اور سائنس کے رخسار کا غازہ ہیں تو اس سلسلے میں "نیا ادب" اور اس کے مبلغین کا نام لینا بھی ادب اور شاعری کی توہین ہے۔

ایک دوسری جگہ میتھو آرنلڈ کہتا ہے:—

"شرافت پر مبنی گہرے خیالات کو زندگی سے مطابق کرنا شاعرانہ عظمت کا ضروری جزو ہے۔ بڑے شاعر کی برتری اسی میں ہے کہ اُن شرائط کے ماتحت جو شاعرانہ حسن و صداقت کے قوانین اُس

پر عائد کرتے ہیں اپنی شاعری کو زندگی سے ہمنوا کر دے یہ موضوع شاعری خواہ انسان ہو خواہ فطرت، خواہ حیات انسانی شاعر اپنے وضع کردہ خیالات سے ان کی ترجمانی کرے۔ اِن خیالات میں شرافت و متانت ہونا لازمی ہے"

نیز :—

"ہمیں یہ امر کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ شاعری فی نفسہٖ تنقید حیات ہے، اور ایک شاعر کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ قوت اور حسن کے ساتھ حیات پر اپنے متخیلہ کی روشنی ڈالتا ہے اور اس سوال کو حل کرنا چاہتا ہے کہ ہمیں کسی طرح جینا چاہیئے۔ ہم اخلاقیات کا مفہوم اکثر غلط سمجھتے اور اس کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں، اخلاقیات کو کسی نظامِ فکر یا عقیدہ سے جن کا عہد حکمرانی گزر چکا مگر چند پیشہ نقالوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں منسلک کر دیتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ان کو سنتے سنتے اکتا جاتے ہیں۔ بعض اوقات ہمیں ایسی شاعری سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جس میں اخلاقیات سے کھلی بغاوت ہو، یا ایسی شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں جو اخلاقیات سے بے پروا ہے اور جس کا موضوع گو غیر متعین ہے مگر طرز ادا میں ندرت پیدا کی گئی ہے۔ دونوں صورتوں میں ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ اس عظیم و نامحدود معنی رکھنے والے لفظ حیات پر برابر غور کرتے رہیں، یہانتک کہ اس کے مفہوم پر کامل عبور ہو جائے۔ جو شاعری اخلاقیات سے بغاوت کرتی ہے وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے، جو شاعری اخلاقیات کو نظر انداز کر دیتی ہے

وہ حیات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔"

میتھو آرنلڈ مزید وضاحت کرتا اور کہتا ہے:-

"میرے متعلق کہا جاتا ہے کہ میں نے شاعری کو تنقید حیات کہہ کر شاعری کو نثر سے ممیز کیا ہے، گویا نثر میں تنقید حیات نہیں ہو سکتی میں نے یہ جملہ یعنی تنقید حیات بہت برس آدھر استعمال کیا تھا اور عام ادب کے متعلق استعمال کیا تھا، شاعری کی تخصیص نہیں کی تھی۔ میرے یہ الفاظ تھے۔ ہر ادب کا منشائے آخر اگر غور کیا جائے تو تنقید حیات کے سوا کچھ نہیں، لیکن شاعری میں تنقید حیات شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یعنی اصل مضمون اور طرز ادا میں سچائی اور متانت ہو، اظہار خیال مناسب الفاظ اور مکمل خوش اسلوبی کے ساتھ ہو...... یہی خوبیاں ہیں جن سے میرا مدعا ایسی تنقید حیات ہے جو شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے پہلو بہ پہلو ہو۔"

اس کے برعکس ہمارا یہ حال ہے کہ ہر شاعر کو جو کنجشک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا شاہین یا عقاب سمجھ کر بشرطیکہ مزدور اور انقلاب کی رٹ لگائے ادب برائے زندگی کا نمائندہ اور ناقد حیات قرار دیتے ہیں۔ سیاسی معتقدات کو نظم کر دینا اور ان امور کو جو سطحی اور پیش پا افتادہ ہیں اور نظم سے نثر میں ہزار درجہ بہتر قوی اور موثر الفاظ میں بیان ہو چکے ہیں بحور و اوزان میں لے آنا (خیر سے نظم آزاد نے یہ قید بھی اٹھا دی) نہ تو شاعری ہے اور نہ تنقید حیات ہے۔ غالباً واضح ہو گیا ہو گا کہ "تنقید حیات" کا وہ مفہوم ہی نہیں جو "ترقی پسند" ادیب میتھو آرنلڈ کے سر تھوپتے ہیں۔ ادب برائے زندگی کا پشت پناہ یہی فقرہ تنقید حیات تھا۔ جب اس کا مفہوم ان کے مفروضہ مفہوم سے الگ ہو گیا تو اب ادب برائے زندگی کی کوئی نئی تعریف گھڑنا ہو گی۔

نیا ادب میری نظر میں

سید احتشام حسین

مخالفوں اور حامیوں نے نئے ادب کو ایک ایسا خواب پریشاں بنا دیا
جس کی تعبیریں ہزاروں شکلوں میں کی جا رہی ہیں، اسے انفرادی خواہشات کی
ترازو پر تولنے کا یہی نتیجہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے موافق یا مخالف چیزیں نئے
ادب میں سے تلاش کرے گا اور اسی کسوٹی پر اس کی خوبی اور خرابی کا فیصلہ کرے گا۔
جو لوگ نئے ادب کو صرف ایک جدت سمجھ کر اس سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار
کرتے ہیں ان کے متعلق تو بہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف نئے ادب کے مفہوم
سے بے خبر ہیں بلکہ ادب ہی کی حقیقت سے ناواقف ہیں، نئے ادب کے اصل مفہوم کو
سمجھتے وقت سب سے بڑے دھوکے کا لفظ "نیا" یا "جدید" ہے، ایک حیثیت سے جو کچھ
بھی ۱۹۴۴ء میں لکھا جا رہا ہے نیا ادب ہے، اور اگر کوئی منطقی اس پر مصر ہو جائے کہ
موجودہ دور کی ہر تحریر کو "نیا" اور "جدید" سمجھا جائے تو صرف لفظی مفہوم کی حیثیت سے
اسے یہ باور کرانا دشوار ہو جائے گا کہ آج بھی جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا بہت سا حصہ
کسی طرح نیا نہیں ہے، اس لئے نئے یا جدید کے مفہوم کا تعین کسی حد تک ضروری
ہے اور یہ تعین، جدت کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر ہی نہ ہونا چاہیئے۔

بعض حضرات آزاد اور ننگی شاعری کو نیا ادب سمجھتے ہیں، جو لوگ اسے اپنے مذاق کے
مطابق نہیں پاتے وہ کہتے ہیں کہ نئے ادب سے مراد وہ بے ڈھنگی شاعری ہے جس کا کوئی

اصول نہیں اس لئے وہ قابل سوختنی ہے، اور بعض حضرات صرف اسی شاعری کو نیا ادب سمجھ کر دوسرے اصناف سخن کو شاعری ماننے سے انکار کرتے ہیں، کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ نئے ادب میں فحاشی عریانی اور جنسی مسائل کے بیان کے سوا اور کچھ نہیں اس لئے اخلاق اور مذہب کے نام پر اسے مٹا دینا چاہیے، کچھ لوگ کہتے ہیں واہ یہی تو نیا ادب ہے اگر اسے مٹانے کی کوشش کی گئی تو نیا ادب مٹ جائے گا، کچھ حضرات نئے ادب میں صرف لاشعور کی تحلیل دیکھتے ہیں اور اس سے نالاں ہیں، کچھ دوسرے لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ شعور کا ذکر بہت ہو چکا اصل چیز تو لاشعور ہے جس سے انسانی فطرت کا نوے فی صدی حصہ ترتیب پاتا ہے، اگر اس کے متعلق نہ لکھا جائے تو پھر نیا ادب کیا ہوا، بہت سے لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نیا ادب ایک طرح کا سیاسی پروپیگنڈا ہے، اور سیاسی پروپیگنڈا ادب نہیں ہو سکتا ہے اس لئے جو لوگ اسے ادب کہتے ہیں انھیں معلوم ہی نہیں کہ ادب تو صرف رنگ و بو، بہار و خزاں، حسن و عشق، کیف و مستی تصور اور تخیل کا نام ہے سیاست کو ادب سے کیا تعلق! اور پھر کچھ لوگ ایسے بھی دکھائی دیتے ہیں جن کا خیال ہے کہ بغیر سیاست کے ادب ایک قدم نہیں چل سکتا یہ چند مثالیں ہیں جن سے ظاہر کرنا مقصود ہے کہ لوگ اپنی محدود بصیرت اور اپنی ذاتی پسند کی روشنی میں تاریخ کی اس اہم ترین صورت کا مطالعہ کرتے ہیں جسے نیا ادب کہا جاتا ہے، اور اس طرح اس کی خوبیوں اور خرابیوں کے متعلق فیصلہ کر دیتے ہیں جیسے ان کی خواہش تاریخ کی رفتار کو سست یا تیز کر دے گی۔

ہاں ایک بات اور شروع ہی میں کہہ دینے کی ہے، ادھر کچھ دنوں سے جب نئے ادب، آزاد شاعری اور ترقی پسند ادب سب کو ایک چیز سمجھ کر ان پر اعتراض کئے جانے لگے اور بعض نئے لکھنے والوں نے نئے ادب کی وضاحت کی، یہ بتایا کہ آج کا سارا ادب، نیا ادب یا ترقی پسند ادب نہیں کہا جا سکتا تو اب کچھ لوگوں نے

یہ کہنا شروع کیا ہے کہ اس کا مفہوم ہی واضح نہیں، کچھ لوگ کچھ کہتے ہیں اور کچھ
لوگ کوئی دوسری بات، مختصر یہ کہ تمام لوگ کوئی سانچے میں ڈھلی ہوئی بات نہیں کہتے
حیرت ہے کہ جو مطالبہ ادب اور ادیبوں سے کبھی نہیں کیا گیا تھا وہ آج کیا جا رہا ہے
حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ قدیم شعراء اور ادباء میں سے تقریباً سب کے سب
متضاد باتوں کو ادب میں جگہ دینے سے پرہیز نہیں کرتے تھے، لیکن نئے ادیبوں
میں سے کتنے ایسے ملیں گے جو کسی خاص نظریۂ حیات کی صحت پر خلوص کے ساتھ یقین
رکھتے ہیں اور ادب کو ہر طرح کی اُلٹی سیدھی لفظی شعبدہ گری کا کھیل نہیں بنانا چاہتے
یہ ناممکن ہے کہ تمام نئے لکھنے والے ایک ہی بات لفظ بہ لفظ کہتے رہیں۔ اعتراض اس وقت
کرنا چاہیے جب بنیادی باتوں کے اظہار میں غلطی ہو، جب حقیقتوں کے بیان میں فریب
سے کام لیا گیا ہو، جب شعور کی جگہ وجدان سے کام لے کر مبہم بات کہی گئی ہو، اس لئے
نئے ادب کی تعریف کو چند تاریخی اور مادی حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنا
چاہیے، یہ خواہش کہ ہر لکھنے والے کے یہاں لفظ بہ لفظ یکسانیت ہو کبھی اس لئے پوری
ہو سکے گی کہ ادب مشین کی بنی ہوئی مٹھائی نہیں ہے کہ جس کے ہاتھ میں قلم ہو وہ ویسی
ہی چیز پیش کر دے اور صنعتی بچوں کی تسکین ہو جائے، نیا ادب آج کے بحرانی دور
میں واقعتاً ایک نہیں ہے، اگرچہ اُسے بنیادی مسائل کے اظہار میں ایک ہونا چاہیے،
میں اوپر چند مثالوں کے ذریعے عرض کر چکا ہوں کہ لوگ نیا ادب کن کن چیزوں کو
سمجھتے ہیں۔ اور کس طرح ان کے خیالات میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔

فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے بنیادی مسائل ہیں جن کی مدد
سے نئے ادب کی معنوی اور فنی حیثیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، اگر نئے ادب کی اتنی
مختلف تعبیریں ہیں تو پھر واقعی نیا ادب کسے سمجھا جائے اور کیوں ایک قسم کے نئے ادب
کو دوسری قسم کے نئے ادب پر کیوں ترجیح دی جائے؟ کون سی خصوصیتیں ادب کو نیا

بناتی ہیں اور کون سی باتیں بہ ظاہر بالکل نئی ہونے کے باوجود کسی خاص ادب کو نیا کہلانے کا مستحق نہیں رکھتیں؟ ان سوالوں کے جواب اور ان کی وضاحت برنئے ادب کی روح تک پہنچنے کا دارومدار ہے۔ جواب دو طریقوں سے دیئے جا سکتے ہیں، کیا چیزیں ہوں تو نیا ادب موجودہ زمانے میں ہوتے ہوئے بھی نیا ادب نہ رہے گا، اور کیا چیزیں نہ ہوں تو ادب کے لئے جدید یا نئے کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن میں بہت زیادہ منطقی اور نپی تلی زبان استعمال کرنے کے بجائے تشریح اور مثالوں سے کام لوں گا۔

زندگی جس طرح پیدا ہوئی، پھیلی اور موجودہ شکل تک پہنچی ہے اس کے متعلق بہت سے نظریئے پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے بعض نظریئے اتنے ہمہ گیر ہیں کہ وہ زندگی کی پوری نشوونما اور اس کے تمام خارجی اور داخلی مظاہر کی غایت اور علت کو واضح کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت اُن کے تفصیلی بیان یا ان کی صحت اور عدم صحت کی بحث نہیں، مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ چونکہ قدما شعوری طور پر زندگی کی مکمل ترجمانی کا ذریعہ ادب اور شاعری کو نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ صرف مذہبی اور روایتی علوم، تصوف اور حکمت کے نکات، اخلاق اور معرفت کے مشہور و معروف خیالات سے واقفیت کافی سمجھتے تھے، جن کا اظہار ادبیات میں ہو جایا کرتا تھا لیکن وہ اپنی شاعری میں کسی مستقل فلسفۂ حیات یا نظریۂ زندگی کو پیش کرنے کا التزام نہیں کرتے تھے، وہ زندگی کی کشمکش کا عکس اپنی شاعری میں نمایاں کرتے تھے لیکن اُن بنیادوں تک نہ جاتے تھے جہاں سے زندگی میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں، وہ یہ دیکھتے تھے کہ کیا ہوا، اس کی جانب اُن کی نگاہ نہ جاتی تھی کہ کیوں ہوا، وہ عام طور سے انفرادی کیفیات کے ترجمان ہوتے تھے، اجتماعی شعور اُن میں بیدار نہ ہوا تھا، وہ بغیر کسی خاص خیال کے اُس طبقہ کا ساتھ دیتے تھے جو برسرِ اقتدار ہوتا تھا، عوام سے اُن کی دلچسپی

معمولی اخلاقی ہمدردی کا نتیجہ ہوتی تھی، اس وقت یہ بحث بھی نہیں ہے کہ یہ سب کچھ
حسن ہے یا عیب، اچھائی ہے یا بُرائی، صرف حقیقت کا اظہار مقصود ہے تاکہ قدیم
اور جدید کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم ہو سکے۔ نیا ادب شعوری طور پر اُس کشمکش
سے واقف ہے جو ایک طرف تو انسان اور فطرت کے درمیان جاری ہے، دوسری طرف
انسان اور انسان کے درمیان، اس لئے اُس نے ماضی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد
یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ چند اصولوں کی بنا پر انسانی زندگی اب تک بہت سی خود رَو
طاقتوں کو روندتی ہوئی اپنے ادراک، شعور اور ارادے کی مدد سے آگے بڑھتی چلی
آئی ہے، اور اگر اُن اصولوں کو اب بھی سمجھ لے تو وہ فطرت کے عناصر پر بھی قابو پا سکتا
ہے اور انسانی سماج کے اندر ایک ایسا توازن بھی قائم کر سکتا ہے جس سے اُسے زیادہ
سے زیادہ آسودگی نصیب ہو۔ اس نے دیکھا کہ اب تک انسانی تاریخ طبقات میں تقسیم
رہی ہے اور عام طور سے ایک طبقہ صاحبِ اقتدار رہا ہے، صاحبِ اقتدار طبقے کی
پہچان یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اور تقسیم پر اُس کا قبضہ ہوتا ہے اور جس کے ہاتھ میں
پیداواری ذرائع ہوتے ہیں اسی کا سکہ ہر شعبۂ حیات میں چلتا ہے، گویا جس چیز کو تہذیب
وتمدن، علم و ادب، حکمت اور فن کہا جاتا ہے اُس کا نشو و نما آزادی کے ساتھ نہیں
ہوتا، بلکہ اُس مخصوص صاحبِ اقتدار طبقہ کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے، دوسرے
لفظوں میں یہ کہ ادب طبقاتی کشمکش میں پیدا ہوتا ہے، وہ ادب جو صاحبِ اقتدار
طبقہ کے ساتھ ہوتا ہے وہ رجعت پسند اور انسانی آزادی کا دشمن ہوتا ہے اور وہ ادب
جو عوام کا ساتھ دیتا ہے یا ان کے لئے زندگی کے دروازے کھول دینے کا متمنی ہے وہ
ترقی پذیر ہوتا ہے، کیونکہ اس طبقاتی کشمکش میں وہ مواقع برابر آتے رہتے ہیں جب
برسرِ اقتدار طبقہ مجبور ہو کر دوسرے طبقہ کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے اور جو طبقہ مٹتے
ہوئے طبقہ کی خاکستر پر اپنا محل تعمیر کرتا ہے وہ کچھ دنوں تک تو ترقی کی راہیں دکھاتا

آتا ہے لیکن پھر کچھ ہی دنوں کے بعد ایسی طاقتوں کو جنم دیتا ہے جنھیں وہ آسودہ نہیں کر سکتا، اس لئے وہ بھی زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نیچے دبے ہوئے طبقے کو ابھرنے کا موقع دینا نہیں چاہتا۔ اس طرح وہ خود غرض، محدود، آزادی کا دشمن اور ترقی کے امکانات کا روک دینے والا طبقہ بن جاتا ہے۔

ان سطروں سے چند واضح نتائج نکالے جا سکتے ہیں، نیا ادب وہ ہے جو آزادی کی جد وجہد کا حامی ہو، نیا ادب وہ ہے جو ترقی کی ہر امکانی کوشش کو سراہے۔ نیا ادب وہ ہے جو رجعت پسندی کا دشمن ہو، نیا ادب وہ ہے جو محدود انسانیت کے مفاد، تہذیب اور ذوق کا علمبردار نہ ہو بلکہ عام طور پر تمام انسانوں کے لئے ایک اعلیٰ تہذیب پیدا کرنے کی تمنا اپنے سینہ میں رکھتا ہو، نیا ادب وہ ہے جو اپنے شعور، علم اور ارادہ کی مدد سے انسانیت کو آگے بڑھائے، اور تسخیر فطرت کے ذریعہ سے جتنے فوائد حاصل ہوں ان کو چند لوگوں میں محدود نہ کرے، بلکہ انھیں عام انسانوں کی ملک بنا دینے کی خواہش رکھتا ہو، نیا ادب وہ ہے جو تغیر کی حقیقت کو وجدان کی مدد سے نہیں علم اور عقل کی مدد سے سمجھے اور تغیر کے صحت بخش عناصر کا ترجمان بن جائے۔ نیا ادب وہ ہے جو ماضی کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز نہ کرے، بلکہ اس کا یقین رکھے کہ اس وقت تک انسانوں کی جد وجہد سے جو نتائج برآمد ہو سکے ہیں وہ اس کی ملک ہیں اور اسے تہذیب کے اس سرمایہ کی وراثت کا حق اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ اس کی صرف حفاظت ہی نہ کرے بلکہ اس میں اضافہ بھی کرتا رہے۔

ایسے نئے ادیب جو کچھ لکھیں گے وہ نیا ادب ہوگا، میں شروع ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ آج نئے ادب کے نام جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ سب نیا ادب نہیں ہے وہ ادب جو انسانوں کو طبقات میں تقسیم کرنے کا حامی ہو نیا ادب کیونکر ہو سکتا ہے وہ ادب جو فاشزم کو سراہے، نیا ادب کیسے ہوتا ہے۔ وہ ادب جو علوم کی نفی، تسخیر فطرت

کے ذرائع، انسانوں کی مادی خوش حالی کا مذاق اڑاتے، نیا ادب کہلائے جانے کا مستحق کیونکر ہوگا، وہ ادب جو انسانیت کی کسی شکل میں تو ہین پسند کرتا ہو نیا ادب نہیں ہو سکتا وہ ادب جو زندگی کی کشمکش سے بے اعتنائی برتے اور برے حالات کو اچھے حالات میں تبدیل کر لینے کا آرزو مند نہ ہو، نیا ادب نہیں کہلایا جا سکتا، نیا ادب شعوری طور پر اس ادب سے مراد ہے جو نئے ادب کی بہترین کوششوں کا نتیجہ ہو۔ جس میں صورت اور معنی، مواد اور ہیئت کے تناسب اور توازن کا انتہائی خیال کیا جاتا اور نیا ادیب کون ہے، اس کا ذکر میں اوپر کی چند سطروں میں مجملاً کر چکا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ دنیا کے تمام اول درجہ کے ادیب اور شاعر، چاہے وہ قدیم ہوں یا جدید، زندگی کے ترجمان اور نقاد رہے ہیں انہوں نے زندگی کی ان دھاراؤں کو سمجھ لیا تھا جن کے جان لینے کے بعد ایک مخصوص دور کی کشمکش کو سمجھا جا سکتا ہے، ان نئے ادب ہر حال میں زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتا ہے۔ کبھی کبھی اعلیٰ قدروں کے مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے کے سلسلہ میں ادیب کو ان ادنیٰ یا زوال پذیر، بیمار یا رجعت پسند قدروں کا تذکرہ بھی کرنا پڑتا ہے جو اعلیٰ قدروں کے حصول میں رکاوٹ ڈالتی ہیں لیکن ادیب کا مقصد ادنیٰ اور بیمار چیزوں کی تشریح اور تفسیر نہیں ہوتا، جہاں وہ گندی باتوں کے بیان ہی کو مقصد سمجھ لے یا اس میں لذت لینے لگے، وہاں اس کے شعور کا نقص ہے، اس لئے ادب جس زندگی کی تخلیق کرنا چاہتا ہے وہ فطرت کی زیادہ اور بے ترتیب شکل کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے، اگر اس نے حقیقت نگاری کے جذبہ کے ماتحت صرف ہر چیز اور ہر خیال کا نقشہ ہو بہو پیش کر دیا تو اس کا ادب تخلیقی نہیں کہا جا سکتا، ڈاکٹر اقبال نے ایک موقع پر اپنی عینیت کو برقرار رکھتے ہوئے لکھا تھا "جو آرٹسٹ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے وہ انسانیت کے لئے باعث برکت ہے، وہ تخلیق میں خدا کا ہمسر ہے، اور اس کی روح میں زمانہ اور ابدیت کا پرتو منعکس ہوتا ہے،

عہد جدید کا آرٹسٹ فطرت سے اکتساب فیض کرتا ہے حالانکہ فطرت بس "ہے" اور اس کا کام یہ ہے کہ ہماری اس جستجو میں رد ڈے اٹکائے جو ہم اس کے لئے کرتے ہیں جو "ہونا چاہئے" اور جسے آرٹسٹ اپنے وجود کی گہرائیوں میں پا سکتا ہے۔" اور اسی خیال کو اپنے اشعار میں بھی ظاہر کیا ہے، مثلاً ایک شعر ہے

بہار برگ پراگندہ را بہم بربست — نگاہ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود

لیکن جس طرح عالم فطرت کی بے ترتیبی میں حسن پیدا کرنا شاعر اور ادیب کا کام ہے اسی طرح عالم انسانی میں جو عدم توازن ہے اس پر نگاہ رکھنا بھی ادیب کے لئے ضروری ہے، نیا ادب اس بات سے منہ نہیں چراتا اسی لئے اُسے کبھی کبھی اُن لوگوں سے تصادم بھی ہوتا ہے جو حالات کا بدلنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں، نیا ادب زندگی اور اس کے مظاہر کے تغیرات سے نہیں گھبراتا۔

بہر حال ادب اور زندگی کا تعلق اب بحث کی بات نہیں رہ گئی ہے، کسی نہ کسی شکل میں تمام لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ جو ادب زندگی سے تعلق نہیں رکھتا وہ سچا ادب نہیں ہے۔ اب بحث طلب بات یہ ہے کہ ادب کو زندگی کی کن قدروں کا ساتھ دینا چاہیئے اور کس شکل میں، سو اس کے متعلق اوپر کی سطروں میں کافی لکھا جا چکا ہے، اگرچہ اس کی حیثیت صرف اشاروں کی ہے، لیکن آج یہ باتیں عام طور پر سمجھی جانے لگی ہیں، انہیں باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم نے ادب کی تعریف اور تشریح ایک بار ان لفظوں میں کی تھی "ادب نہ صرف زندگی کی ترجمانی کا نام ہے اور نہ محض تنقید حیات کا، بلکہ ادب ایک ایسا سماجی عمل ہے جس کی مدد سے انسان اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے جو آزادی اور متعلقات آزادی کے حاصل کرنے کی جدوجہد کے سلسلہ میں اس کے یہاں پیدا ہوتی ہے۔ یہ کوشش جب جذبات کی آمیزش سے حسین طریق اظہار اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نام ادب پڑ جاتا ہے۔ اسی لئے ادب اتنا ہمہ گیر ہے کہ زندگی کے تمام شعبے اس کی زد

میں آجاتے ہیں اور کائنات ایک حرکتِ مسلسل کی حیثیت سے سمجھ میں آتی ہے، جس میں تخریب اور تعمیر، تعمیر اور تخریب کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ تغیر کی حقیقت کو انسانی اعمال اور اشغال کی روشنی میں سمجھے بغیر ان محرکات کا علم نہیں ہو سکتا جن سے ادب پیدا ہوتا ہے۔ زندگی اور اس کے روابط کا جامد نظریہ نہ تو زندگی کے سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے اور نہ ادب سمجھنے میں۔"

میں اسے بار بار کہہ چکا ہوں کہ آج کے تمام ادیب ان حقیقتوں سے واقف نہیں ہیں اس لئے وہ بھی اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر راستہ چل رہے ہیں لیکن وہ تمام ادیب اور شاعر جو نئے کہلانا چاہتے ہیں، جو زندہ رہنا چاہتے ہیں ان کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی کے ماضی اور حال کا مطالعہ کریں۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ماضی کیوں ویسا تھا۔ حال کیوں آسودگی بخش نہیں ہے۔ اور مستقبل میں زندگی کے امکانات کیا ہیں۔ یقیناً اس کے لئے بڑے علم اور مطالعہ کی ضرورت ہے، یہ مطالعہ جو نیا شعور پیدا کرے گا وہی نئے ادب کی خصوصیت بن جائے گا۔ اور اسی کی مدد سے نئے ادب کو پہچانا جائے گا۔ اگر کوئی خلوص کے ساتھ اسے سمجھنا چاہے تو یہ کوئی ایسی پیچیدہ بات بھی نہیں، مغلوں کے آخر زمانہ تک مخصوص قسم کے جاگیرداری نظام کا زوال ہوتا رہا۔ اگر اس میں کچھ تغیرات ہوئے بھی تو وہ بنیادی نہیں سطحی تھے، اس لئے ہندوستانی ادیب کے شعور میں بھی کسی نئی زندگی کا تصور نہیں، حالات کو بدلنے کی امنگ نہیں، زندگی سے مقابلہ کی طاقت نہیں، کوئی نصب العین نہیں۔ اگر تبدیلی کی خواہش ہے تو اس کی حیثیت صرف شخصی اور انفرادی مزاج اور تصور پرستی کی ہے۔ اور آرزوؤں سے تقدیریں نہیں بدلا کرتیں۔ ادب اور سماج ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں اس لئے غدر کے قریب ہندوستانی زندگی میں جو نئی کشمکش پیدا ہوئی اس نے نیا شعور پیدا کیا اور ادب کی پرانی قدروں کو اسی طرح دھکا لگا جس طرح

زندگی کے دوسرے شعبوں میں نئے زاویئے دکھائی دینے لگے تھے، پھر متوسط طبقہ کی کشمکش نے قومیت کو اور عوام کی ضروریات اور بیداری نے بین الاقوامیت کو جنم دیا، ان احساسات کے ظاہر کرنے میں کبھی زندگی آگے بڑھ گئی، کبھی شعر و ادب نے رستہ دکھایا، نئی زندگی بے حد تیز رفتار ہے، سیاسیات میں آزادی کی جد و جہد جاری ہے، لوگ معاشی آزادی بھی چاہتے ہیں، آسودگی اور ترقی کے خواہشمند بھی ہیں، علم و حکمت کا عروج بھی دیکھنے کے آرزو رکھتے ہیں، انفرادی اور خاندانی زندگی میں جو انتشار ہے اس کو بھی درست کرنے کی فکر ہے، ایسی حالت میں شاعر اور ادیب کو کسی نہ کسی طرف ہونا ہے، آزادی اور غلامی، سوشلزم اور فاشزم، اطمینان اور بے اطمینانی، ترقی اور رجعت، ان سب کے بارے میں فریق بننا ہے اور یہ فریق بننا صرف جذبات اور وجدان کی بنا پر ممکن نہیں ہے بلکہ اس میں عقل اور شعور کو دخل ہونا چاہیئے، اگر شعور اور عقل سے کام لیا جائے گا تو ان مسائل کے سمجھنے میں پراگندگی اور انتشار اور ایک بڑی حد تک تجزیہ میں غلطی کا امکان نہ ہوگا۔

اس وقت تک نئے ادب کے نام سے جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں یہ حصوصیتیں کم ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے، کچھ لکھنے والوں نے ضروری باتوں سے قطع نظر کر کے بعض ثانوی چیزوں پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اور اس طرح نیا ادب اہمیت اس جگہ مرکوز کرنے لگا ہے، جہاں اس کی زیادہ ضرورت نہیں ہے، مثال کے طور پر ہم چند چیزوں کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ شاعری میں آج بہت سے نئے لکھنے والے آزاد نظم نگاری کی طرف مائل ہیں۔ ایک صنف سخن ہونے کی حیثیت سے اس میں وہ سب کچھ ہے جو شاعرانہ جذبات کے اظہار کے آلے میں ہونا چاہیئے، لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے علاوہ اور کسی دوسری طرح کی نظم چاہے وہ مواد کے لحاظ سے

بالکل انقلابی ہو، نئی نہیں، وہ غلطی پر ہیں آزاد نظم کے سانچے میں اگر زندگی کی اعلیٰ قدروں کا بیان شاعرانہ انداز میں نہ ہو تو پھر صرف آزاد نظم نگاری کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اسی طرح تحلیل نفسی ادب کا ایک موضوع بن سکتی ہے، لاشعور کا تجزیہ بھی برا نہیں ہے۔ لیکن اگر لاشعور کے تجزیہ کا مقصد صرف یہ رہ جائے کہ ایک اندھا آدمی ایک اندھیری کوٹھڑی میں ایک کالی بلی کو تلاش کر رہا ہو جو وہاں نہ ہو تو پھر اس تجزیہ کی نہ تو ادبی حیثیت ہے اور نہ افادی، تجزیۂ نفس میں اگر لاشعور کے معاشی اور معاشرتی اسباب تک نظر نہ گئی تو پھر اس سے کوئی ادبی خدمت مقصود نہیں ہو سکتی، ہماری زندگی میں جنسی عدم توازن موجود ہے اور اس کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے، لیکن اگر یہ ذکر صرف لذت کے لئے ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں لیکن اگر اس کے بیان میں ان اسباب کا پتہ بھی چلے جن کی وجہ سے یہ عدم توازن پیدا ہوا ہے اور اُن اسباب کے دور کرنے کی طرف اشارہ بھی ہو تو پھر وہی بیان اہم بن سکتا ہے، اسی کسوٹی پر ہم موجودہ ادب کی ہر صنف اور ہر رجحان کو پرکھ کر خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

تفصیل کا موقع نہیں اس لئے میں اپنے خیالات کو کچھ اس طرح خلاصہ کی شکل میں پیش کر سکتا ہوں، نیا ادب وہ ہے جو فن کی لطافتوں کا خیال رکھتے ہوئے آج کے معاشی معاشرتی شعور کے صحت بخش عناصر کو حسین لباس میں پیش کرے، نیا ادب ماضی اور مستقبل کا تذکرہ بھی کر سکتا ہے لیکن دونوں حالتوں میں اس کا خیال رکھنا پڑے گا کہ انسانی جدوجہد کا ایسا تجزیہ ہو جس سے انسانوں کے ترقی کے امکانات کا پتہ چل سکے، ماضی کا ذکر صرف تقدس کے خیال سے یا اس کی مخالفت کے ارادہ سے نہ ہو اور مستقبل کے بارے میں صرف خواہش پرستیاں نہ ہوں، نئے ادب میں جتنا اس معیار پر پورا اترتا ہے وہ میرے خیال میں سچا نیا ادب ہے اور جو ان چیزوں کی مخالفت کرتا ہے وہ نیا ہونے کے باوجود نیا نہیں ہے۔

نیا ادب میری نظر میں

حامد حسن قادری

میں زندگی کی طرح شعر و ادب میں انقلاب کو ناگزیر سمجھتا ہوں، اس کی ہر نئی شکل نئے اسلوب، نئے موضوع کو نظر استحسان سے دیکھتا ہوں لیکن اس ظاہر کے اندر باطن پر نظر ڈالتا ہوں، اور باطن ہی کا تعطر و تعفن میری نظر میں اس کو گوارا یا ناگوار بناتا ہے۔

بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کا تین چوتھائی حصہ گزرنے تک اردو شاعری کا مقصد بجز شاعری یا دربارداری کے کچھ نہ تھا، "شاعرانہ پیغام" اس زمانہ میں کوئی چیز نہ تھا، ملکی و سیاسی کا کیا ذکر، مذہبی، قومی، معاشرتی اصلاح بھی پیش نظر نہ تھی، شاعری کرتے تھے اس لئے کہ سب کرتے ہیں، شاعری کرتے تھے اس لئے کہ اور کچھ نہ کر سکتے تھے، شاعری کرتے تھے اس لئے کہ اور کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ اگر اُن کی شاعری "روایتی" تھی تو ایسی ہی سمجھی جاتی تھی، زندگی کی کوئی تعمیر یا تخریب نہ اُن کو مقصود تھی نہ اُن کی شاعری سے اس پر کوئی اثر پڑتا تھا، حضرت میرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ مسند رشد و ہدایت پر متمکن تھے اور ہزارہا بندگانِ خدا کو راہِ خدا پر لا رہے تھے، اور صدہا کو صاحب دل اور روشن ضمیر بنا دیا تھا، لیکن یہ بزرگ بھی غزل لکھتے تھے، تو حسن و عشق کے کھلے معاملات اور عریاں جذبات بے تکلف لکھ جاتے تھے، اس لئے کہ اُن کے زمانہ میں ہر قال کو

حال سمجھ لینے کا دستور نہ تھا، اسی لئے نہ میر و سودا کو کسی نے مطعون کیا، نہ رنگین و جان صاحب پر انگلیاں اٹھیں اس لئے کہ ان کی شاعری سے نہ اخلاق بنتے تھے نہ بگڑتے تھے، نہ معیشت اصلاح میں کوئی مدوجزر پیدا ہوتا تھا، نہ مذہب کی کشتی ڈانواڈول ہوتی تھی، سبب ظاہر ہے کہ وہ اپنے مذہب و ایمان سے مطمئن تھے، اپنی تہذیب و معاشرت سے خوش تھے۔

اس کے ساتھ اس زمانہ کی ایک اور حقیقت بھی نہایت اہم اور قابل لحاظ ہے، حیات و معاشرت کا ایک جزو لاینفک عورت ہے جس کی افتاد و رفتار پر انسان کی ذاتی و اجتماعی حیات و مسرت کا انحصار ہے، اگلے زمانہ میں عورت ذات ایک مبارک جمود و جہالت کی حالت میں تھی، اپنی زندگی پر قانع و مطمئن، مردوں کے اعمال سے بے نیاز اور ان کی شاعری سے بے خبر، اگر شاعری و ادبیات میں کوئی تخریبی عنصر تھا تو اس کا اثر چار دیواری کے اندر نہ پہنچتا تھا، اس لئے اس زمانہ کی تمام زندگی "بیرون خانہ" اور "درون خانہ" امواج نرم خیز کی طرح چلی جا رہی تھی۔

اس حالت کا عصر حاضر سے مقابلہ کیجئے، مذہب سے بے اطمینانی، وضع قدیم سے دشمنی، اخلاق سے آزادی، جذبات کی بے باکی، تعلیم کی غلط رفتار، مخلوط تعلیم، سیاسی بے چینی، تحریکات اشتراکیت وغیرہ کا غلط استعمال، سرمایہ داری کا اعمال و اخلاق پر اثر، صنعت و تجارت کی مسابقت کا سوسائٹی پر اثر، یورپ کی کورانہ تقلید، عریانی و بے حیائی کی ترغیب و تشویق، جنگ سابق و حال سے زندگی کی دشواریاں، مردوں کی کمی، عورتوں سے اُن کی خانہ بدری، یورپ کی زنانہ تحریکات کا ہندوستان میں رواج۔

ایسی کتنی باتیں ہیں جن سے ہماری ذاتی، عائلی، مجلسی، قومی، ملکی زندگی اور ہماری ادبیات اور شاعری متاثر ہو رہی ہے، انہی کے زیر اثر جدید رجحانات

پیدا ہو رہے ہیں اور انقلابی شاعری کا حشر برپا ہو رہا ہے، دنیا کے بعض نظریئے اور تحریکیں جو مغربی و مشرقی و انقلابی اردو شاعری کا موضوع بنی ہیں، ان پر صرف ایک سرسری نظر اور مختصر اشارے اس وقت ممکن ہیں۔

(۱) سب سے بڑی تحریک خدا سے بیزاری ہے، مذہب کا سب سے بڑا کام انسان کے قوائے ذہنی و عملی کی تہذیب اور روک تھام ہے، انسان ایسی بے پناہ مخلوق، ایسا وحشی حیوان اور خطرناک درندہ ہے کہ اس کو ایک حد کے اندر رکھنا بڑی سخت جکڑ اور پکڑ کا کام تھا، خدا کا تصور اور مذہب کے قوانین کا یہی مقصد تھا، خدا سے بغاوت ہمیشہ ہوتی رہی ہے لیکن کبھی حکومت اور کبھی سوسائٹی اور ان سے زیادہ خود خدا کا تصور جو سماعی اور سماجی طور پر طبائع میں جاگزیں ہو چکا تھا اس شورش کو دباتا رہا، علماء و حکماء نہ صرف یونانی و فرنگی بلکہ اسلامی بھی خدا کی ہستی اور ذات و صفات میں بحث کرتے رہے ہیں۔ لیکن وہ صرف علم و حکمت کا ایک مسئلہ تھا، عملی اور اجتماعی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، پھر انیسویں صدی میں بعض مغربی اہل حکمت و سائنس نے جدید نظریات کی روشنی میں پیش کیا اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ایسی ہر تحریک عالمگیر بننے کے لئے آمادہ تھی۔ خیال و رائے کی آزادی عام ہو رہی تھی، حکومت اور سوسائٹی اپنے اثرات کو استعمال کرنے سے دستکش ہو رہے تھے چنانچہ بیسویں صدی کے آتے آتے یہ آگ مغرب سے مشرق اور ہندوستان میں آگئی، بیسویں صدی نے اپنی آزادی کے پنکھوں کا رخ بھی ادھر پھیر دیا، انسان عجیب تضاد سے مرکب ہے، جنگ، بے امنی، مصائب، قحط، افلاس، جہاں خدا کو یاد دلاتے ہیں، خدا سے برگشتہ بھی کر دیا کرتے ہیں، ہندوستان پر ان آفات کے علاوہ غلامی کی بلا اور فرقہ بندی اور تفرقہ اندازی کا وبال بھی تھا، ہندوستان کے مفکروں نے ان امراض کا سبب مذہب کو قرار دیا، اور علاج تجویز کیا کہ خدا کو ہندوستان سے نکال دیا جائے

اور مذہب کا استیصال کر دیا جائے، تو ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی سب صرف ہندوستانی رہ جائیں گے، اور ایک قوم، ایک حکومت ممکن ہوگی، چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بارہا خدا و مذہب سے بیزاری کی تبلیغ فرمائی ہے، یہ مسئلہ بھی ذہنیت ہند کی تاریخ میں قابل غور ہے کہ اتحاد ملکی کی یہ تدبیر ہندوؤں کو سوجھی ہے، ممکن ہے مسلمان انفرادی و ذاتی طور پر خدا و مذہب سے منکر و برگشتہ ہوں لیکن قومی حیثیت سے مسلمانوں نے کبھی اس مسئلہ کو پیش نہیں کیا۔

خدا و مذہب سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہونے کے بعد قدیم رسم و رواج سماج روایت، اخلاق سب سے آزاد ہو جانا آسان ہو جاتا ہے، عورتوں میں اس خیال کی کارفرمائی شرم و حیا، عفت و عصمت کی بندشوں کو توڑ دینا سہل کر دیتی ہے۔ آج کل کے نوجوان مردوں اور عورتوں کے اخلاق نمایاں طور پر اس تحریک سے متاثر اور ان کی شاعری پر موثر ہیں۔

(۲) دوسری زبردست تحریک سرمایہ داری اور صنعت و حرفت کی اسالیبت ہے۔ سرمایہ داری کا اثر ملک پر، حکومت پر، دولت پر، مزدوروں پر، غلامی و آزادی پر، افلاس و خوشحالی پر جو کچھ ہے ظاہر ہے اور بارہا بحث میں آچکا ہے لیکن اس پہلو پر کم غور و تامل کیا گیا ہے کہ سرمایہ داری کی لعنت انسان کے ذاتی اور اجتماعی اخلاق پر بھی چھا جاتی ہے، مذہب و اخلاق سے بیزاری، عزت و آبرو سے بے پروائی نفس و ہوس کی شعلہ انگیزی اور تمام اعمال حسنہ کی تباہی میں اعانت کرتی ہے تمام مغرب و مشرق اور ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے۔ مغرب کے سرمایہ دار اور صناع و تاجر کے پیش نظر اصل میں اپنی دولت افزائی تھی، لیکن صناع و تاجر اپنے مقصد کے لئے دنیا کی تمام تحریکات سے کام لیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ عیش پرستی، ہوسناکی کا جوش خود بینی و خود آرائی کا شوق، آزادی و بے باکی کا زور عالمگیر ہے، چنانچہ وہ اس جذبہ

اُبھارنے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لئے صنعت کے ذریعہ سے ایجادات کرتا ہے اور تجارت کے وسیلہ سے اُن کو عام کر دیتا ہے۔ ایک ہیرپن اور لپ اسٹک سے لے کر ہوا تک تمام آرائش و آسائش اُلتعیش و تفریح کے سامان میں اسی سرمایہ داری و تجارت کی کارفرمائی ہے۔ ملک کے دولتمند عیش پرست اُن سرمایہ داروں اور صناعوں کے گویا اعزازی ایجنٹ ہوتے ہیں جن کے ذریعہ سے متوسط اور ادنیٰ طبقہ اسراف و تعیش میں مبتلا ہوتا ہے۔ ملک کے اخبار، مصنف، شاعر، اشتہار چھاپ کر جنسیات کی کتابیں، افسانے اور ناول لکھ کر، نظمیں شائع کر کے ان ہی سرمایہ داروں کی گویا بلامعاوضہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ ہندوستان کا افلاس اور بدحالی، قوت عمل کا اضمحلال، جسم و دماغ کی ناتوانی، اخلاق کی پستی، سب کے سب بظاہر بالواسطہ لیکن اصل میں بلاواسطہ اسی سرمایہ داری کے کرشمے ہیں، یہ میں نے عصر حاضر کی "ہیئت کذائی" کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب کا صرف ایک رخ بطور خاکہ پیش کیا ہے۔ رفتار زمانہ اور انقلاب عالم کی رو سے ان کا ناگزیر ہونا اور قضائے مبرم کی طرح نازل ہونا مجھے تسلیم ہے لیکن واقعات کے اس ربط و تسلسل سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

انقلابی شاعروں نے "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" پر بحثیں کی ہیں اور صرف دوسرے نظریہ و اصول کو اپنا مسلک قرار دیا ہے، یہ زندگی جس کی وہ شعر و ادب کے ذریعہ سے اصلاح و ترقی چاہتے ہیں، کہے کہ اپنے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ علم و تعلیم، اعمال و اخلاق، معیشت و معاشرت، افلاس اور قحط، مزدور اور کسان سب ان کے احاطۂ عمل میں شامل ہیں، لیکن جاننے قابل یہ ہے کہ وہ فی الواقع غریب ہندوستان کی کیا اور کتنی خدمت اپنے شعر و ادب سے کر رہے ہیں اور کس قدر فرائض اپنے عمل سے انجام دے رہے ہیں۔ قدیم شاعروں کی یہ بڑی جیت تھی کہ ان سے کوئی شخص یہ سوالات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ شعر برائے شعر کہتے تھے یا برائے گفتن لیکن اب

شاعروں نے پیغامبری، رہنمائی اور انقلاب انگیزی کے مناصب اپنے لئے تجویز کر لئے ہیں، تو حیاتِ عملی پر نظر کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کوئی انقلابی شاعر اپنا تن من دھن تج کر اصلاح ملک وقوم کا بیڑہ اٹھائے ہوئے نہیں ہے۔ اب رہی شاعرانہ پیغمبری یا پیغمبرانہ شاعری، تو وہاں کا حال تو اللہ جانے لیکن شاعری کو پڑھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اگر نظم و شعر میں دل کا درد منتقل ہو سکتا ہے تو بلا استثنا کسی ایک شاعر کی ایک نظم میں بھی دردِ دل اور سوزِ جگر کا وجود نہیں ہے۔ اور نہیں ہو سکتا جب تک ان شاعروں کے حالات وہ ہیں جو ہیں۔ حالات سے میری مراد سیرت واخلاق نہیں بلکہ ان کی بے عملی اور زبانی باتیں ہیں۔ اب وہ زمانہ ہے کہ شاعر و شعر میں شخص و عکس کی نسبت ہونی چاہیئے، یہ نہ ہو تو شاعر شاعر نہیں اور شعر شعر نہیں، یہاں شاعر سے میرا مقصود نوجوان انقلابی شاعر ہیں جنہوں نے نظموں میں نئے رجحان، نئے موضوع، نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، ان سے زیادہ پرانے اور پختہ کار شاعر کبھی کبھی استثنائی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ اور صحیح تدبر و تفکر کا ثبوت دیتے ہیں، لیکن بیسویں صدی کے انقلابی شعرائے سابقین میں صرف ایک اقبال کو کامل استثنا و انفراد حاصل ہے۔ جو صرف ہندوستان و ایران میں نہیں، تمام ممالکِ اسلامی میں تنہا مفکرِ اعظم اور شاعرِ اعظم تھا۔

تدریجاً انقلابی شاعروں کے ارتقائے فکر، رفتارِ تخیل اور ایجادِ اسالیب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو الٹی ورق گردانی سے ورقِ اول پر اقبال ہی نظر آئیں گے اقبال کی زندگی اور شاعری کے دورِ آخر میں تمام یورپ اور ایشیا میں انقلابِ عظیم برپا ہو گیا تھا۔ حکومت، تمدن، رفتار و کردار، ذہن و فکر سب بدل رہے تھے۔ اسلامی حکومتیں خاص طور پر اس سیلاب کی زد میں آگئی تھیں، اسلامی روایات، اسلامی نظریاتِ حیات، اسلامی اصولِ معیشت اس زد میں بہتے شروع ہو گئے تھے اور یہ

تمام دفترِ عالم، یہ پورا صحیفۂ انقلاب تمام مفکروں اور شاعروں کے سامنے کھلا ہوا تھا۔
عرب و ایران کا ہر مفکر اس کتاب کو ایسی ہی آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتا تھا جیسے ہندوستان
کا دیدہ ور۔ لیکن حیرت انگیز و بصیرت افروز حقیقت یہ ہے کہ ایک پلڑے میں تنہا اقبال
کی فارسی و اردو نظمیں اور دوسرے پلڑے میں ایران کی تمام جدید انقلابی شاعری، ترازو کو
اٹھایا جائے تو اقبال کی گراں وزنی کے مقابلے میں تمام عجم نہایت سبک ثابت ہوتا ہے
زبان و محاورہ میں نہیں، سبکِ ایرانی بھی نہیں، اصنافِ سخن میں نہیں، اشکالِ نظم
میں نہیں، بلکہ پیامِ شاعرانہ میں، ژرف نگاہی میں، حکمت و تدبر میں، زمانہ کی نبض شناسی
میں، مستقبل بینی میں، صحت اصلاح و تبلیغ میں۔ رفعتِ تخیل میں، جدتِ اسلوب میں
یہ بات صرف میں نہیں کہتا۔ خود اہلِ ایران کو اقبال کی اس برتری اور پیغمبری
کا اعتراف ہے۔

اب دوبارہ ایرانی شاعری کے پلڑے میں اس کی جگہ تمام اردو جدید انقلابی
شاعری کو رکھ کر تولیے پھر بھی اقبال ہی من ثقلت موازینہ کے زمرے میں آتے
ہیں، اس بات سے شاعری کے کسی مبصر کو انکار نہ ہونا چاہیے لیکن اگر ہو تو پھر یہ میرا
ہی دعویٰ سہی، میرے نزدیک اقبال کی اس فضیلت کا سبب ان کے ذوقِ صحیح
کے ساتھ ان کا قلبِ سلیم بھی ہے۔ اسی سلامتِ قلب نے بالآخر ان کے ارادہ و گفتار
میں مطابقت پیدا کر کے ان کو صحیح مفکر اور حقیقی شاعر بنا دیا تھا۔ مجھے اس وقت اقبال
کا تذکرہ کرنے سے اسی بات کو گوش گذار کرنا تھا کہ حقیقی شاعری اور پیغمبرانہ شاعری
کے لیے شاعر کو اپنی روح اور اپنی شاعری کی روح کو "یک جان و دو قالب" کرنا لازم ہے
یہ بات اقبال میں تھی اور ان کے علاوہ ہندوستان کے کسی بوڑھے، جوان اور
نوجوان شاعر میں نہیں ہے، لہٰذا عصرِ حاضر کے زندہ و موجود شعرائے اردو میں کوئی
فرد واحد پیغمبر شاعر نہیں ہے اس پیغمبری کے لیے ادراک کی صحت احساس کی شدت

جذبہ کی واقفیت، تجربہ کی واردیت کے ساتھ اسباب پر گہری نگاہ، نتائج پر دوربین نظر حقائق کا صحیح تجزیہ، حوادث پر درست تنقید کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ ذہن عام سے بلند تر تخیل، الہامی بیان، پیغمبرانہ اسلوب لازم ہے اور اس سے بھی بڑھ کر پیام شاعرانہ کی محکمیت "نسخۂ کیمیا" کی قطعیت اور قال وحال کی مطابقت ناگزیر ہے، کوئی مصلح ومبلغ، کوئی ہادی و پیغمبر صرف باتیں نہیں بناتا، اپنے "پیغام" کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کہتا۔ اپنے عمل سے اپنے قول کی صداقت کو ثابت کرتا ہے۔ اور بالآخر زمانہ کے اہل بصیرت اور دیدہ ورنقاد اس کے پیغام کی یکسانی و ہمواری کا اعتراف کرتے ہیں، اس کے دشمن اس کے قول پر عمل نہ کریں لیکن اس کے عمل یقین اور ثبات و استقلال کو ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ پیغمبرانہ اوصاف آج صرف ہندوستان میں نہیں تمام عالم اسلامی کے کس شاعر میں ہیں؟ اس ادعق اور موہبت عظمیٰ کا بالفعل دور "ظفرہ" اور عہد تعطل ہے، جب تک

"مردے از غیب بروں آید وکارے بکند"

لیکن میں شاعری کو صرف اس قسم میں محدود نہیں سمجھتا، شاعری کام بھی ہے اور کھیل بھی، شاعری برائے زندگی بھی ہے اور برائے شعروادب بھی اور برائے لاشے بھی، مشرق وہندوستان کا نظریۂ شاعری مغرب سے بالکل مختلف رہا ہے۔ اور ہے اور رہے گا، جب تک کہ ارض نوح اور یونان کی طرح ہندوستان اور ہندوستانیت کا تختہ نہ الٹ جائے یعنی ہندوستان کا شاعر کبھی اس طرح بھی شعر کہتا ہے کہ اس کے پیش نظر نہ زندگی کا کوئی مسئلہ ہوتا ہے نہ شعروادب کی ترقی، بلکہ اس کو شعر کی موزونیت پسند ہوتی ہے، شعر کہنے کو اس کا جی چاہتا ہے شعر کہنا اس کے لئے باتیں کرنے کے برابر آسان ہوتا ہے، اسی شوق و شغف میں لوگوں نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ مثنوی مولانا روم کو اردو میں نظم کر دیا

ہے۔ مسائل فقہ اور قواعد صرف و نحو نظم میں لکھ دیئے ہیں۔ مولوی علی حیدر نظم طباطبائی
نے شرح دیوان غالب میں یہ لطیفہ لکھا ہے۔

"ڈیون پورٹ کی کتاب الخلافۃ کا ترجمہ بنگلہ زبان میں کرنا منظور تھا
حیدرآباد کے مسلمان بنگالی اس کے ترجمہ کے مشتاق ہوئے تھے اور
اہل دنیا برج سے اس امر کی درخواست کی تھی۔ اس پر کئی بنگالیوں
سے ہم لوگوں نے اجرت ترجمہ کے متعلق گفتگو کی۔ ہر ایک نے یہی خواہش
کی کہ ہمیں اجازت دو کہ نظم میں اس کا ترجمہ کریں کیونکہ نثر سے
نظم ہم کو سہل معلوم ہوتی ہے۔"

آپ ان چیزوں کو شاعری سے تشبیہ نہ کریں گے ایسی بھی آپ سے متفق ہوں
لیکن ان کے نظم ہونے سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ یورپ کی شاعری میں ایسے
کارنامے نہیں ہوتے لیکن ہندوستان کی عادت و روایت ادراک نور و مصرف شاعری
سے بالکل مطابق ہیں۔ ہندوستان کی شاعرانہ ذہنیت کی تاریخ میں ان سے صرف نظر
ممکن نہیں۔ ہندوستان کے یہ مشاعرے یورپ میں کہاں ہوتے ہیں۔ طرحی غزلوں
کے گلدستے انگلش، فرنچ، جرمن زبانوں میں کب شائع ہوتے ہیں۔ فی البدیہہ نظم کہنے
کا رواج وہاں کہاں۔ ہندوستان میں باتیں کرتے کرتے تاریخ یا رباعی کہہ دیتے
ہیں۔ چلتے پھرتے غزل موزوں کر لیتے ہیں۔ کتابوں اور مقالوں میں برمحل شعر لکھتے ہیں۔
تقریروں میں شعر پڑھتے ہیں۔ خطوں میں شعر لکھتے ہیں۔ عوام بازاروں میں شعر گاتے چلتے ہیں۔ خوانا
بے تکلف صحبتوں میں شعر سنتے سناتے ہیں۔ فقروں کا توازن اور نظم کے قوافی ہندوستان کی گھٹی میں پڑے
ہوئے ہیں۔ یہاں کی کہاوتیں اور مثلیں موزوں اور مقفیٰ ہیں۔

ان میں سے بیشتر کو اعلیٰ شاعری سے خارج کیا جا سکتا ہے، لیکن ہندوستان
کے شاعرانہ ماحول سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ کسی طفل شیرخوار کو ہندوستان سے

سے جاکر انگریزوں کے سپرد کر دیا جائے تو وہ بالآخر خواب بھی انگریزی میں دیکھا کرے گا
لیکن اس طرح کا مسخ فطرت ہندوستان میں رہنے والوں کے لئے کسی مستقبل بعید میں
بھی امکان وقوع نہیں رکھتا لیکن ہمارے انقلابی شاعر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے
اپنی رفتار بدل دی ہے تو گویا ہندوستان کی افتاد طبع بھی بدل گئی۔

میرا مقصود یہ ہے کہ انقلاب جدید کے اثر سے اردو شاعری کے قدیم موضوعات
میں تغیر ہو جائے، قدیم اصناف تبدیل ہو جائیں، نئے تجربات لکھے جائیں، نئی افادی
حیثیت پیدا ہو جائے، کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ہندوستانیت فنا نہ ہونی چاہیئے۔
مشرقیت تباہ نہ ہو جائے، قدیم طرز تخئیل اور اسلوب بیان میں خرابیاں بھی تھیں
جو زمانہ کی "نظر بندی" کے سبب سے اُن لوگوں کو محسوس نہ ہوتی تھیں، اور اب فکر و نظر
کی آزادی کے سبب سے نمایاں ہو گئی ہیں، یہ سب لائق ترک یا قابل اصلاح ہیں، لیکن
ہندوستانی قالب اور ہندوستانی روح دونوں باقی رہنا ضروری ہیں، مغربی شاعری
کے موضوع، خیالات، اسالیب سب کچھ اردو شاعری میں لیے جا سکتے ہیں اور لینے
چاہیئیں۔ لیکن وہ جو ہندوستان کی فطرت میں جذب ہو سکیں اور زبان میں سمو ئے
جا سکیں، انقلابی شاعر بس اسی نکتہ کو بھولے ہوئے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ میدان سیاست
میں تو یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم سب سے پہلے ہندوستانی ہیں پھر اور کچھ ہیں، لیکن شاعری
میں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم کچھ ہوں یا نہ ہوں ہندوستانی ہرگز نہیں ہیں۔

نئی شاعری کی جدت آفرینی کے مختلف اوضاع و عناصر ہیں اور ان کی الگ
الگ حیثیت اور اہمیت ہے۔ مثلاً تحریر میں مصرعوں یا مصرعوں کے ٹکڑوں کو الگ
الگ لکھنا . . . ، نیچے اوپر لکھنا، ایک مصرعہ چند سوال و جواب سے مرکب ہو تو ان
کو افسانے کے مکالمے کے طور پر لکھنا یا نظم کے بندوں میں قافیوں کی نئی ترتیب پیدا
کرنا، یہ سب ظاہری باتیں ہیں، باطن شاعری سے ان کو کچھ تعلق نہیں، لباس کی

قطع وتراش ہے، کمرے کے فرنیچر کی ترتیب ہے۔ مختلف وضع وقطع کے لباس یکساں طور پر بھلے معلوم ہوتے ہیں، کمرے کو بہت صورتوں سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ اصل چیز لباس اور کمرے میں ہیئت کی موزونیت اور ذوق کی لطافت ہے، میرے نزدیک مصرعوں کی ہر ترتیب جائز ہے۔

دوسری جدت بے قافیہ نظم کی ہے۔ میں اس کو ہندوستانی مذاق کے خلاف سمجھتا ہوں۔ ترکِ قافیہ کے لازم و ناگزیر ہونے کا میں قائل نہیں، جو انقلابی شاعر قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی بہت آسانی سے نہایت خوبصورت نظمیں لکھ دیتے ہیں یورپ کی شاعری میں "بلینک ورس" طویل نظموں اور ڈراموں کے لئے اختیار کی گئی تھی اور وہاں اس کی ضرورت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ قافیہ کی پابندی نہ ہونے سے نظم کو نثر کی ترتیب سے قریب تر لایا جا سکتا ہے۔ اور افراد افسانہ کے مختصر مکالمے اور طویل تقریریں نثر سے جس قدر مماثل اور روزمرہ سے جس قدر مطابق ہوں بہتر ہے۔ لیکن وہاں بھی وہ نظم سرتاسر نثر نہیں ہو سکتی، یہاں اردو کی مختصر نظموں میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں، نظم کو نثر کی ترتیب کے ساتھ موزوں کرنا نظم کے محاسن میں نہیں ہے۔ بلکہ نظم کا نثر سے ممتاز ہونا ہی اس کا حسن ہے، بہرحال میں بے قافیہ نظم کا سخت مخالف نہیں۔ نظم کے مقفیٰ یا معریٰ ہونے کو میں نفسِ شاعری سے خارج سمجھتا ہوں، میں محض نثر میں شاعری کا قائل ہوں، قدیم وجدید نثر نگاروں کے صدہا فقرے ہیں جن کو میں اشعار سے بہتر شعریت کا حامل سمجھتا ہوں، وہ نثر اگر کسی وزن میں . . . رکھ دی جائے تو میں زیادہ متاثر ہوں گا۔ اور اگر مقفیٰ ہو جانے سے تاثیر میں فرق نہ آئے تو اور زیادہ لطف اندوز ہوں گا۔ قافیہ سے لازم طور پر تاثیر میں فرق آ جانے کا میں قائل نہیں۔

تیسری انقلابی شان آزاد نظم ہے، یہ عجیب ہیولیٰ ہے اور عجیب بے ڈول اور

سے تکی چیز یعنی اس میں قافیہ کے علاوہ وزن سے بھی آزادی ہے یا کم از کم وزن کی آزادی حاصل ہے کہ ایک ہی نظم میں مختلف وزن شامل ہو جائیں یا ایک وزن کسی مصرعہ میں پورا ہو، کسی میں آدھا، کسی میں چوتھائی، کبھی وزن کا نقش بالکل توڑ دیا جاتا ہے اور اس کی تیلیاں بکھری رہتی ہیں یعنی بجائے نظم کے نثر ہی کو آزاد نظم کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں اتنا امتیاز پیدا کر دیا جاتا ہے کہ الفاظ کی ترتیب سے ایک قسم کا لحن یا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے، اس کو انگریزی میں فری ورس (آزاد نظم) کہتے ہیں۔

آزاد نظم یورپ و امریکہ کی ایجاد ہے، لیکن اس کا وجود ہماری زبان تو میں بھی ہے۔ قرآن مجید لحن و آہنگ سے بھرا ہوا ہے، گلستان کے بہت سے فقروں میں آہنگ موجود ہے۔ آزاد نظم کے آہنگ کو انگریزی میں کیڈنس (CADENCE) کہتے ہیں اس کے لئے عربی الفاظ "لحن" و "تجوید" ہیں۔ قرآن کا لحن یا تجوید مشہور ہے، لیکن اس کو نظم کہنا ہمارے تصور شاعری کے بھی خلاف ہے اور قرآن مجید کے لئے بھی کسر شان ہے۔ بقولہ تعالیٰ وما ینبغی لہ[1]۔ قرآن کا اعجاز یہی ہے کہ نظم نہیں نثر ہے، لیکن عرب کے شاعروں نے اس نثر کو سن کر اپنی نظمیں پھاڑ کر پھینک دی تھیں اور قرآن مجید کا تو ذکر ہی کیا ہے، کوئی شاعر گلستاں کے فقروں کو نظم کر دے تو ہم نثر کے بدلے میں اس نظم کو لینے کے لئے تیار نہیں، یہی بات اگر وہ آزاد نظم کے حامی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ صرف حمایت اور خالی کہنا ہی کہنا ہوگا، کاش وہ واقعی ایسا کہنے کا حق رکھتے، پھر پرانے خیال کے لوگوں میں کم سے کم میں تو ان کی آزاد نظم کو آنکھوں سے لگاتا، اس لئے کہ میرے نزدیک نثر میں بھی شاعری ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے زمانے میں شاعری مضمون اور بیان دونوں کے اعجاز کا نام ہے یا واضح تر یوں سمجھئے کہ جو خیال، جذبہ یا تجربہ ہو، شاعر کا ذاتی

[1] وما علمنٰہ الشعر وما ینبغی لہ۔ ہم نے رسول اللہ کو شاعری نہیں سکھائی اور آپ ان کے شایان شان
کے نہیں۔

احساس اور اس کی اپنی دریافت ہو، احساس میں شدت اور دریافت میں جدت ہو، وہ بات کہے جو دوسرے نے نہ کہی ہو اور اس طرح کہے کہ اس سے بہتر نہ کہی جاسکے لیکن سننے والا جانے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا یعنی یہ محسوس کرے کہ یہ بات بلاشبہ اسی طرح کہنے کی تھی اور اس پر متحیر ہو کہ یہ نکتہ شاعر نے کہاں سے پیدا کیا۔ اور یہ پیرایۂ بیان کس طرح ذہن میں آیا، خلاصہ یہ کہ سن کر روح وجد میں آجائے اور دماغ ادبی مسرت سے سرشار ہو جائے۔

لیکن انقلابی شاعروں کی آزاد نظم کیا پابند نظم میں بھی شاعری کی یہ روح اور نظم کے یہ اجزاء بہت کم ملتے ہیں، پابند (وزن و قافیہ) نظم کے تو بہری نظریں اور مصالح بھی ہیں۔ ادبیات میں اس کے لئے بہت گنجائش ہے، لیکن آزاد نظم جس میں اور کچھ نہیں ہے، اگر اس میں یہ بھی نہ ہو تو پھر ادب میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ شاعری کا تعلق مضمون و مفہوم، تخئیل و تجربہ، بیان و اسلوب سے جہاں تک ہے نثر میں بھی ممکن ہے لیکن دنیا کی ہر زبان میں شاعری کا وجود ہے، نثر میں شاعری کہیں کافی نہیں سمجھی جاتی تو معلوم ہوتا ہے ان دونوں میں کوئی مابہ الامتیاز ہے اور وہ بجز وزن، لحن اور لے کے کچھ نہیں۔ اس لئے وزن نظم کے لئے پہلی شرط ہے یہ بحث ہی فضول ہے کہ لوازمِ شعر و نظم میں وزن کا کیا درجہ ہے۔ پہلا درجہ ہے سب سے پہلا۔

اب وزن اور لحن کا یہ حال ہے کہ اس کی ساخت زبان کی ساخت کے تابع ہے اور اس کی پسندیدگی اہل زبان کی طبیعت اور عادت پر منحصر ہے۔ انگریزی گانا گایا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بے سرے چیخ رہے ہیں۔ حالانکہ انگریز اسی کو سن کر جھوم جھوم جاتے ہیں۔ ہم نے بعض عربی بحریں متروک کر دی ہیں۔ اس لئے کہ ان سے ہمارا ذوقِ نغمہ پورا نہیں ہوتا۔ تو اب اردو میں آزاد نظم کو گوارا کرنے کے لئے ہمارے مذاق اور طبیعت میں تغیر ہونا چاہیئے۔ جب تک نہ ہو اس آزادی کو کیونکر گوارا کیا جائے۔

آزاد نظم کی بے وزنی اور پریشاں وزنی کا اندازہ ان چند نمونوں سے ہو سکتا ہے۔

(۱) میراجی اپنی نظم (ترغیب) میں لکھتے ہیں۔

رسیلے جرائم کی خوشبو — فعولن فعولن فعولن

مرے ذہن میں آ رہی ہے — فعولن فعولن فعولن

مجھے جذبۂ پاک سے دور لے جا رہی ہے — فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن

جوانی کا جوبن ہے — فعولن فعولن

قوانین اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں — فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن

اس وزن کا ایک مصرعہ چار فعولن سے بنتا ہے۔ لیکن اس نظم میں کہیں پورے وزن کا ½ ہے کہیں ¾ کہیں ⅔ اور کہیں ⅔ لیکن بعض مصرعے پورے بھی ہیں جو یہاں نہیں لکھے تاہم اس میں یہ خصوصیت ہے کہ ایک ہی وزن کے رکن سے مرکب ہونے کے سبب سے تمام نظم میں وزن ٹوٹتا نہیں۔ اور بے تنتشر نہیں ہوتی اسی وزن کی ایک نظم میں ایک شاعر نے نہایت طویل مصرعے مرتب کئے ہیں۔

(۲) وشوا متر عادل کی نظم (راہرو) کے بعض متفرق مصرعے دیکھئے۔

بکھرتی ہوئی چاندنی اپنے خاموش ہونٹوں سے سرگوشیاں کر رہی ہے — ۸ بار فعولن

وہ سرگوشیاں جن کو سنتا ہوں لیکن یہ ظاہر کئے جا رہا ہوں — ۷ بار ″

نہیں میں نے ان کو سنا ہی نہیں ہے — ۴ بار ″

مرے پیچھے پھیلے ہوئے راستہ پر کہانی کے ذرّوں کی رنگین تصویریں بنتی جا رہی ہیں

۱۰ بار فعولن

لیکن اگر وزن مختلف ارکان سے مرکب ہو تو یہ ہم آہنگی قائم نہیں رہ سکتی۔ دیکھئے۔

(۳) میراجی کی نظم (اونچا مکان) کے بعض مصرعے ہیں۔

(۱) بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے استادہ ہے اک نقش عجیب

(فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ تن فعلاتن فعلات)

(۲) اے تمدن کے نقیب (فاعلاتن فعلات)

(۳) تیری صورت ہے مہیب (فاعلاتن فعلات)

(۴) ذہن انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)

(۵) ڈھل کے لہروں میں نئی گیت سنائی مجھے دیتے ہیں مگر

(فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ تن فعلن)

(۶) ان میں ایک جوش ہے بیداد کا فریاد کا اک عکس روانہ

(فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ تن فعلات)

(۷) اور الفاظ میں افسانے ہیں بے خوابی کے (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)

یہ سات مصرعے نظم کے آغاز کے ہیں اور مسلسل ہیں، متفرق نہیں۔ ان میں سے چوتھا اور ساتواں مصرع وزن کی متعارف ہیں پورا ہے۔ پہلے پانچویں اور چھٹے میں اضافہ کیا گیا ہے لیکن تینوں جگہ وزن کے آخری حصے سے بڑھایا ہے، یہ بھی ایک اصول کی بات ہے۔ دوسرے اور تیسرے مصرعوں یا ٹکڑوں میں وزن کے پہلے حصہ سے پورے اور ادھورے ارکان لئے گئے ہیں۔

. . . . اس میں بھی مضائقہ نہیں لیکن ان تمام و ناتمام مصرعوں کو مسلسل پڑھنے سے لے اور لحن کی وہ یکسانی نہیں رہتی جو پہلے دو نمونوں میں (فعولن) کی تکرار کے سبب سے تھی۔ اور وزن اگر مختلف ارکان سے مرکب ہو تو سب مصرعے بالکل برابر ہونے چاہئیں۔ وزن مقررکو کتنا ہی بڑھا دیا جائے لیکن اضافہ تمام مصرعوں میں یکساں متوازن اور متوازی ہونا چاہیئے۔

یہ اشارہ غالباً بے محل نہ ہوگا کہ وزن کو حدِ مقررہ سے بڑھانا جدید شاعروں کی ایجاد نہیں ہے، اگلے شاعروں نے بھی بڑے لمبے لمبے مصرعے مرتب کئے ہیں اور قصیدے کے قصیدے لکھ دیئے ہیں۔ لیکن اپنے عروض اور شاعری کے اصول کو قائم رکھا ہے۔ ایک صاحب نے تو اس قدر لے بڑھائی تھی کہ ان کے ایک شعر کے دو مصرعے کتاب کے ایک صفحے میں نہیں سما سکتے تھے، میں نے تیس سال ہوئے جس پرچے میں دیکھے تھے وہ چھوٹی تقطیع کا تھا اور اس کے تین صفحوں میں دو مصرعے چھپے تھے، یہ عروض کی پہلوانی ہے، شاعری نہیں، لیکن ایک حد کے اندر وزن کو حد سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ جیسا مولوی غلام امام شہید نے کیا ہے، انہوں نے فارسی واردو کے قصیدے نعت شریف میں لکھے ہیں۔ ان میں بھی اوپر کے تیسرے نمونہ کا وزن بڑھایا گیا ہے، شہید کے اردو قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

یہ تحریکیں ہے پہ یونہ کہ جمہور ہیں مسرور ہر اک باغ ہیں معمور ہے سامان بہار
گل چٹکتا ہے چمن زور مہکتا ہے ٹپکتا ہے ہر اک شاخ تر و تازہ کی فیضان بہار

اور فارسی قصیدہ کا مقطع یہ ہے۔

ایں شہید ست جگر تفتہ و پژمردہ و افسردہ و غم دیدہ و شوریدہ و آشفتہ دماغ
کہ بدیوانگی و وحشت و سودا و جنون غم و احوال زبونست غزلخوان بہار

اس کا وزن یہ ہے۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات

یہ وزن حد سے بڑھ کر بھی حد کے اندر اس لئے ہے کہ چار رکنوں سے ایک مصرع کا مرتب ہونا معمول و متعارف ہے۔ شہید نے دو مصرعوں کا ایک مصرع بنا دیا ہے۔ اسی کو حد سے باہر اس شاعر نے کر دیا تھا جس نے فعلاتن کی تکرار دو سو مرتبہ کر دی تھی

بہرحال ان نمونوں سے آزاد نظم کے آہنگ کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اس آہنگ کا قائم رکھنا ذرا مشق اور توجہ کا کام ہے، میراجی اور دوسرے شاعروں سے

کہیں کہیں یہ نے ٹوٹ بھی گئی ہے لیکن اس موضوع پر زیادہ روشنی ڈالنا مقصود نہیں ہے۔ میں بذات خود نظم کی اس آزادی کو بھی گوارا کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ شاعری کے اصلی محاسن موجود ہوں۔ لیکن تلخ صداقت یہ ہے کہ کسی انقلابی شاعر کا پیام تو کیا متعین ہوتا کوئی ایک مسلک، ایک مقصد بھی مقرر نہیں، یہ لوگ اپنے آپ کو سیاسی رہنما بھی کہتے ہیں، سماجی مصلح بھی، مفکر و مدبر بھی، شاعر و مصور بھی، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب یہ حضرات کوئی سیاسی یا سماجی، بیانی یا خیالی نظم کہتے ہیں تو یہ بات بھول جاتے ہیں کہ وہ شاعر بھی ہیں اور شاعری و موزونیت میں بڑا فرق ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظم میں سیاست، اصلاح، انقلاب جو کچھ ہو مکمل اور معیاری شاعری نہیں ہوتی۔ بعض نمونے دیکھیے۔

ن۔ م۔ راشد مشہور انقلابی آزاد نگار شاعر ہیں (نذر محمد نام۔ راشد تخلص) گوجرانوالہ (پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ تیس سال سے کچھ زیادہ عمر ہے۔ ایم۔ اے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہیں۔ بقول اپنے اردو میں آزاد نظم کے بانی اور شاعرِ اول ہیں۔ ان کی ایک عجیب نظم ملاحظہ ہو جس میں وطن پرستی اور ہوس پرستی کا اتحاد یکجا کیا گیا ہے۔

انتقام

اس کا چہرہ، اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے

اور آتشداں میں انگاروں کا شور
ان بتوں کی بے حسی پر خشمگیں
اجلی اجلی اونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ
اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں

اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے | میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
اجنبی عورت کا جسم | جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

اس میں شاعری کیا ہے، اچھوتا پن کیا ہے، کیا یہ وطن پرستی کا صحیح جذبہ ہے، کیا اربابِ وطن کو اسی طرح انتقام لینے کی ہدایت مقصود ہے؟

راشد صاحب اس نظم کو اپنا شاہکار نہیں سمجھتے۔ اُن کی رائے میں ان کی بہترین نظم (دریچے کے قریب) ہے۔ لیکن بہت طویل ہے اس لئے درج نہیں کرتا۔ مجھے اس میں اتنی بھی برجستگی اور جدت نظر نہیں آئی جتنی انتقام میں ہے۔ صرف اس کا ایک ٹکڑا جدید رجحانات کے نمونے کے طور پر نقل کرتا ہوں۔ ن۔م۔ راشد "دریچے کے قریب" والی نظم میں کسی کو "میری جان" کہہ کر اپنے پاس دریچے کے قریب بلاتے ہیں اور شہر کے مختلف مناظر دکھاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔

اسی مینار کے سایہ تلے کچھ یاد بھی ہے | ایک عفریت — اداس
اپنے بیکار خدا کے مانند | تین سو سال کی ذلت کا نشاں
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں | ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں

خدا کی بیکاری اور بے ہودگی کی تبلیغ بھی انقلابی شاعری کا ایک عنصر ہے۔

میں راشد صاحب کی ایک اور نظم کو ان کی آخری نظموں سے بہتر سمجھتا ہوں۔

یہ نظم ان کے مجموعہ کلام (ماورا) کی آخری نظموں میں سے ہے۔

اجنبی عورت | میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی | یہ عماراتِ قدیم
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں | یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار
کاش اک دیوارِ ظلم | چاندنی میں نوحہ خواں

اجنبی کے دستِ غارتگر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاش اک "دیوارِ رنگ"
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ سیہ پیکر برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہرخند

یہ گذرگاہوں پہ دیوانہ سا جواں
جس کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بے باک، مزدوروں کا سیلابِ عظیم
ارضِ مشرق - ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں -

اس نظم کا مرکزی خیال بہت خوبصورت ہے۔ ایک مشرقی عورت کا ایشیا کے حالِ زار پر افسوس، دستِ غارتگر کی شکایت، دیوارِ ظلم و ستم کے حائل ہونے پر تاسف، بڑی صحت اور موزونیت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ آخری چار مصرعے نظم کی جان ہیں اور نہایت موثر ہیں۔ مغرب و مشرق کا مقابلہ نہایت حسرت آمیز الفاظ میں کیا گیا ہے اور بہت دلکش و بصیرت افروز ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس میں نظم کا کوئی لطف نہیں۔ یہ مضمون کامل مترنم اور مقفیٰ مصرعوں میں لکھا جا سکتا تھا اور سامعین پر زیادہ اثر کرتا۔

آزاد نگاروں اور انقلابی شاعروں میں راشد صاحب کو ایک طرح کا امتیاز حاصل ہے۔ نظم کی ظاہری شکل میں وہ آہنگ اور لحن کو موسیقی اور ترنم کی [illegible] نہیں رکھتے ہیں۔ میراجی اور دوسرے شاعروں کی طرح راشد کی نظموں میں قنوطیت نہیں ہوتی۔ مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے بھی راشد کے ذہن میں زیادہ توانائی، وسعت اور جدت ہے۔ دوسروں کا سا ابہام بھی ان کے ہاں کم ہوتا ہے۔ موضوعِ شاعری میں البتہ ان کی ذہنیت اور رجحان عجیب ہے۔ ان کے احساسات، تجربات اور ماحول و میلان کا اثر ہوگا کہ وہ باوجود نوجوانی اور صحت مند

ہونے کے زندگی اور دنیا سے بیزار نظر آتے ہیں، یہ ان کی افتادِ طبع کا اثر ہو سکتا ہے
فطرت و ماحول کی ہم آہنگی اور اس کا تاثر اور نظم میں اس کی تاثیر بالکل نیچرل ہے
اور اس لئے مستحسن ہے، لیکن زندگی سے فرار، شکست خوردگی، "مرتا کیا نہ کرتا" کا
اصول غیر متوازن دماغ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ "عورت" اور "شراب" میں گم ہو کر زندگی سے
پناہ لینا، نہ فی الواقع صحیح تدارک ہے، نہ ایک انقلابی شاعر کے لیے درست موضوع سخن
راشد کے اندر جذبۂ انتقام بھی نہایت شدید ہے، لیکن عملی بے چارگی کے سبب سے
وہ بھی عروج سے نا بہ ہے، یا سوختۂ آتشِ ہوس، ایک جگہ کہتے ہیں۔

اے مری ہمعِ شبستانِ وفا
بھول جا میرے لئے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے
تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور ہے تو سرا پردۂ نسیان میں ہے
تو مسرت ہے مری، تو مری بیداری ہے
مجھے آغوش میں لے

(ن۔م۔ راشد)

دوسرے مشہور و مقبول انقلابی شاعر میراجی ہیں، ان کا وطن بھی پنجاب ہے
اور شاید "زندہ دلانِ پنجاب" میں سب سے زندہ دل شاعر ہیں۔ کتابستان الآباد
کی شائع کردہ رہبری بہترین نظم، میں میراجی نے اپنی بہترین نظم کے ساتھ اپنے
حالات اور خصوصاً احساسات شاعرانہ کا تجزیہ وار تقانہ التفصیل سے چھپوایا ہے
اسی مجموعہ سے ن۔م۔ راشد کے حالات اوپر لکھے گئے تھے، شاعر کے ذہن و فکر پر جو
مناظر و ماحول اثر کرتے ہیں ان کا علم شاعر و شاعری کے مطالعہ کے لئے نہایت اہم
ہے۔ میراجی کا گھٹیاوار، بلوچستان، ملتان میں اپنے لڑکپن اور جوانی میں رہے۔

وہاں کے تاثرات بڑی خوبصورتی سے بیان کئے ہیں۔ ان کا خلاصہ خود میراجی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"میری نظموں کا نمایاں پہلو ان کی جنسی حیثیت ہے۔ طفلی ہی میں فطرت سے ہم آہنگی کا احساس تھا، پربت پہ دور سے نظر آتا پھرا ایک لڑکا ہوا اس کا تھا جس نے نسائی پیکر سے متعلق ہو کر آئندہ زندگی میں دبی ہوئی خواہشات کے اثر سے ایک ایسی حیثیت اختیار کر لی جس سے رہائی حاصل کرنے کو شعر کا سہارا لینا پڑا۔ یوں لباس میں دلچسپی ابتدا ہی سے طبیعت کا خاصہ رہی، ساری پہنے ہوئے کوئی نسائی پیکر میرے ذہن میں لٹکے ہوئے پردے یا چھائے ہوئے دھندلکے کا تصور لاتا ہے۔ نسائی لباس کا یہ بیان زندگی کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے، یعنی عورت سے دوری۔ آسودہ عشقی، احتیاط کی قبل از وقت بیداری سکول کے زمانہ ہی میں ہوئی تھی۔ (اس زمانہ کے ایک واقعہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں) اس نے ایک سفید دھوتی پہن رکھی تھی، اور دس گیارہ سال کی عمر، نیز شاید گھر کی بات ہونے کے لحاظ سے کوئی زیر جامہ نہ تھا، چنانچہ سورج کی کرنیں لباس کے پردے میں سے چھنتے ہوئے زیریں جسم کے خط و خال کا اظہار کر رہی تھیں، یہ چوری کا منظر بھی تحت الشعور کی پاتال سے گول گول کر مختلف بھیس بھرتا ہوا کئی جگہ اپنی نظموں میں دکھائی دیا ہے، چنانچہ روزن، کھڑکی اور دروازے کی میں یہی وجہ سمجھتا ہوں۔"

یہاں نظریہ حسن کی بحث آ جاتی ہے۔ انقلابی شاعر "ادب برائے زندگی" کے قائل ہیں، میراجی بھی اس پر صاد ہے۔ زندگی میں حسن قدرت اور جمالِ بشری دونوں

شامل و لازم ہیں، ان کا مشاہدہ، مطالعہ اور بیان، الہامات والہیات سے ملے کر شعر و ادب تک ہر جگہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے، اکبر الہ آبادی کا یہ مشورہ:

حسن جس چیز میں ہو دیکھ کے خوش کر دل کو
بند کر لے مگر آنکھیں، اگر انسان میں ہو

کوئی نہ مانے گا، نہ سہی، مرزا داغ کی یہ نصیحت:

بہارِ عمر میں باغِ جہاں کی سیر کرو
کھلا ہوا ہے یہ گلزار دیکھتے جاؤ

سب قبول کریں گے، بہتر، لیکن حسن کا "نظریۂ افادیت" جو یورپ کا مفروضہ اور ہمارے شاعروں کا مختار و معمول ہے اگر یہی ہے جو ان کی نظموں میں ہے جو ن. م راشد کی مندرجہ بالا نظم (انتقام) میں ہے، جو میراجی کی اپنی منتخبہ بہترین نظم (اونچا مکان) میں ہے تو صرف ہندوستانیت نہیں، انسانیت کا خاتمہ ہے اور بہیمیت و سبعیت کی حکومت، میراجی کا شاہکار (اونچا مکان) پڑھنے سمجھنے اور غور کرنے کی چیز ہے۔ لیکن اس قدر طویل ہے کہ سب کا نقل کرنا طولِ امل ہے، میراجی ایک اونچے مکان میں "اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لیے پہنچے ہیں اور "اونچے مکان" سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

میں یہ سنتا تھا ترے بام گرانبار میں بستر ہے بچھا
اور اک نازنیں لیٹی ہے وہاں۔ تنہائی
ایک پھیکی سی تھکن بن کے گھسی جاتی ہے
ذہن میں اس کے، مگر وہ بیتاب
منظر اس کی ہے پردہ لرزے
پیرہن ایک ڈھلکتا ہوا بادل بن جائے
اور سر در آئے اک ان دیکھی انوکھی صورت
کچھ غرض اس کو نہیں ہے اس سے

دل کو بھاتی ہے، نہیں بھاتی ہے
آنے والے کی ادا
اس کا ہر ایک ہی مقصود، وہ استادہ کرے
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب
جس کی صورت سے کراہت آئے
اور وہ بن جائے ترا مد مقابل پل میں
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہو جائے
اور وہ نازنیں بے ساختہ بے لاگ اٹھے کے بغیر

ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے
رنگ کے مضطر کے مانند سبکسار کرے

شب کے بے روح تماشائی کو
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقش عجیب

بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ
ایک گرتی ہوئی دیوار کے مانند لچک کھا جائے

مختصر لرزش چشم رہے

یہ نظم تشریح و تنقید سے بالاتر ہے، اس کے مضمون و موضوع سے ناظرین لطف اندوز ہوں اور زندگی کی اس عکاسی میں انقلاب و ادب کے حسن و جمال کا مشاہدہ کریں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور نوجوان پنجابی کے انقلاب پرور خیالات دیکھیے، شریف کنجاہی لکھتے ہیں کہ اپنی نظموں میں سے مجھے "پسپائی" سب سے زیادہ پسند ہے، مرد کی خواہش کے سامنے عورت کی "پسپائی" یا (بقول میرا جی) "ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنا"۔ ملاحظہ ہو "پسپائی"

کیوں جگاتے ہو مرے سینہ میں امیدوں کو
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے

رہنے دو اتنا نہ احسان کرو
اس کو تاریک ہی تم رہنے دو

میں تو پردیسی ہوں اور آئی ہوں دو دن کے لئے
دل کی دنیا میں اجالا نہ کرو

کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی
میری امیدوں کو مدہوش پڑا رہنے دو

اور پھر آنے کا امکان نہیں
تم نہیں مانوگے؟

روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں
تم دیکھتے ہی جاؤ گے

کیوں جگاتے ہو مرے سینہ میں امیدوں کو
اچھا دیکھو

کیوں جگاتے ہو مرے دل کے چراغ
لو جلاؤ مرے سینے کے چراغ، دل کی بستی میں اجالا کردو

میں نے یہ سالے دیئے خود ہی بجھا رکھے ہیں
پھر مرے جینے کا، یا مرنے کا، سامان کردو

یہ عریانی، یہ فحاشی قدیم شاعری میں بہت زیادہ بہت کھلی ہوئی ہے اور ایسی ہی قابلِ اعتراض ہے جیسی یہ نظمیں، لیکن وہاں وزن کا ترنم ہے، قافیہ کی دلکشی شاعرانہ تخیل

ہے۔ اسلوب کا اچھوتا پن ہے۔ یہاں ان میں سے ایک بات بھی نہیں صرف ہوس انگیزی اور محض گناہ بے لذت میراجی، ن م راشد، شریعت ہی کا کوئی ہم وطن فارسی گو انہیں کی کسی ہم وطن شاہد بازاری کی تعریف کرتا ہے۔

چہ پروائے زند در سینہ دارد   کہ دار الضرب در شلوار دارد

میراجی انصاف کریں کہ ان کی "گرتی ہوئی دیوار" میں زیادہ بلاغت ہے یا اس شاعر کے "دار الضرب" میں۔ حالانکہ فحش میں یہ زیادہ ہے۔ ناپاکی میں دونوں برابر ہیں "امیر مینائی" کہتے ہیں۔

کھلتے ہیں کیا بجلیاں بھر کے سسکی   تڑپ کر وہ تڑپانے والے ہوئے ہیں

نہایت عریاں، بیحد غیر مہذب، لیکن محاکات میں میراجی اپنی نظم "اونچا مکان" کے آخری چار مصرعوں سے مقابلہ کر دیکھیں۔ ان دو مثالوں پر بس نہیں۔ صدہا ایسی مثالیں موجود ہیں لیکن اصلی پہلو یہ ہے کہ قدیم شاعری میں یہ مضامین متفرقات میں شامل ہیں، منتشر ہیں اور بے مقصد ہیں۔ نہ کہنے والوں کا بجز کہنے کے کوئی مدعا تھا، نہ سننے والوں پر بجز لطف اندوزی کے کوئی اثر تھا۔ اس کے برخلاف انقلابی شاعری میں یہ نظمیں خاص مقصد اور نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ آرٹ ہے، یہ ادب برائے زندگی ہے اور یہی آرٹ اور ادب کے حیلے سے یہ جذبات اور خیالات اس قدر صاف اور عریاں نہ سہی عورتیں بھی اپنی نظموں اور غزلوں میں لکھتی ہیں، شاعر بیگموں اور خاتونوں کے کلام سے مثالیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک آنسہ "کشوری، نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی ٹی لکھتی ہیں

آنکھوں کو اشکبار کیے جا رہی ہوں میں   اک بیوفا سے پیار کیے جا رہی ہوں میں

آنا کسی کا آج بھی مسدود ہے مگر   کیوں دیر سے سنگھار کیے جا رہی ہوں میں

ایک اور خاتون کنیز فاطمہ کاش ایم۔ اے فرماتی ہیں :-

تمام منظرِ ہستی پہ چھا کے پیتی ہوں | شباب و شعر کی دنیا جگا کے پیتی ہوں
شراب میں کبھی جوانی ملا کے پیتی ہوں | کسی کی گود میں خود کو بٹھا کے پیتی ہوں

ان سے بھی تیز تر ایک لطیفہ سنئے جس میں شاعرات کے کلام سے بھی زیادہ کمال ہے۔ ایک بیگم صاحبہ نے ریختی گو شاعر شیدا لکھنوی کے کلام پر تنقید کی تھی، اس میں شاعر کی جدید و نادر تشبیہات کی مثال میں اس شعر کا بھی انتخاب کیا تھا:-

بی بی انگی ہوئی ہے نوکر سے | ناؤ ٹھیری ہوئی ہے لنگر سے

اور اس شعر کی تعریف میں لکھا تھا "ریختی تو کیا غزل بھی اس کا جواب قیامت تک پیش نہیں کر سکتی!"

بلا شبہ شاعر ہر حال میں شاعر ہے اور نقاد ہر رنگ میں نقاد، ان بیگم صاحبہ نے تو اس انتخاب و تنقید میں نسوانی حیا و حجاب کے خلاف کوئی بات نہیں کی، لیکن مجھے اس وقت ان کا نام اور مضمون کا پتہ لکھتے شرم آتی ہے یہ بات بھی دو تین سال کی پرانی ہو گئی ہے۔

یہ آزادی و بیباکی نظموں سے زیادہ عورتوں کے افسانوں اور ناولوں میں موجود ہے۔ عصمت چغتائی صاحبہ جنسی رنگ کی مصوری میں نہایت ممتاز ہیں انہوں نے بہترین افسانوں کے مجموعہ کے لئے اپنا افسانہ "لحاف" بہترین سمجھا ہے۔ ایسی ہی بلکہ زیادہ عریانی ان کے اکثر افسانوں میں ہے اور انہیں یہ کیا سوجھی ہے کہ ادبی انقلاب پسند ادیب و شاعر اس آرٹ کے سوا مشکل سے کچھ اور لکھتی ہے۔

اہلِ ہند میں یہ جنسی ہیجانات اور ادبیاتِ ہند میں جنسی رجحانات جیسا دفعتاً جس قدر زور و شور کے ساتھ پیدا ہوا اور بڑھا ہے مشکل سے کوئی دوسری تحریک بجز سیاسی شورش کے اس کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اور یہ تحریک بھی

اصل میں سیاست ہندی کا فیضان ہے۔ اب سے بیس برس پہلے جنگ، سابق کے بعد سیاست ہند میں جو انقلاب رونما ہوا اور آزادی ملک کے لئے جارحانہ و مدافعانہ احتجاجی و انتقامی تحریکیں برپا ہوئیں، اُن کی کامیابی میں مدد دینے کے لئے عورتیں بیکایک میدانِ عمل میں آگئیں، یورپ میں سالہا سال سے عورت سیاست کا دست راست بنی ہوئی ہے، ویسی تعلیم و تربیت اور تجربات و قابلیت نہ ہو تو ہندوستانی دیویاں دھرنا دھرنے اور "جھنڈا اونچا" رکھنے سے بھی گیا گئی گزری تھیں، قوم و وطن کی آزادی کے لئے نکلی تھیں تو پتا، پتی اور پتر کو کچھ سوچنے سمجھنے کہنے سننے کا کیا موقع تھا، وطن کے نام پر ہر بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ اب اس آزادی کی تکمیل کے لئے عورتوں کی عام تعلیم اور اعلیٰ تعلیم لازم تھی۔ اور معاشرت میں مغربی تقلید کے بغیر چارہ کار نہ تھا، مردوں، عورتوں کی مخلوط تعلیم، مخلوط جلسے، مخلوط ملازمتیں، مخلوط کھیل، ہر جگہ اختلاط و اجتماع ناگزیر تھا۔ اس کے لئے سماج کے بندھن توڑنے کی ضرورت تھی، یہ بندش "بند نقاب" کھلنے کے بعد بھی رہی اور ایک جنسی کشمکش پیدا ہو گئی، ایک ہیجان برپا ہو گیا، یہی کشمکش، یہی ہیجان شعر و ادب کا رجحان بن گیا ہے۔ اور ترقی پسند ادب، افسانے، نظمیں جنسیات کی کتابیں، تصویریں، ریڈیو، سینما، سب اس آگ کو تیز تر کر رہے ہیں، یہ ادبی رجحان گویا ہندوستان کی تہذیب اور معاشرت سے ایک انتقام ہے، ایک جارحانہ اقدام ہے۔ یہ شعر و ادب کی منزل بھی ہے اور جنسی آزادی کی راہ و منزل بھی، ذہنی کشمکش عملی آزادی کی راہیں نکال لیتی ہے۔ یہ راہیں ہر بڑے شہر میں کھلی ہوئی ہیں، کتنے باغ اور ہوٹل شب و روز یہی مناظر پیش کرتے ہیں، انقلابی ادیبوں اور شاعروں کا شعر و ادب زندگی کے واسطے ہے اس لئے ادب و زندگی کے تعلق پر اتنا لکھنا پڑا، ورنہ جیسا میں نے پہلے کہا ہے، میں ادب برائے زندگی کا بھی قائل

ہوں نظم کی آزادوضعی بھی مجھے گوارا ہے۔ لیکن ادب ادب ہو اور شاعری شاعری۔
میرے نزدیک "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" میں تضاد نہیں ہے، ان کا اجتماع ممکن ہے، ادب و شاعری، نثر و نظم اپنی ادبی و شعری تکمیل کا ایک معیار رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک درجہ اور اسلوب ہمیشہ ایک اور یکساں رہتا ہے بدل نہیں سکتا، خیالات، تجربے موضوعات نئے نئے ہوں، بدلتے رہیں اور بدلتے رہتے ہیں، لیکن ان کے اظہار کا بہترین طریقہ نہیں بدلتا، ایک کامل شاعر، فطری شاعر، پیغمبر شاعر ہمیشہ وہی طریقہ پسند کرتا ہے، یہ ادب برائے ادب اور شاعری برائے شاعری ہے، اب اگر وہ تجربے اور موضوع زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہیں، تو وہ شاعری برائے زندگی بھی ہو جائے گی، اور برائے شاعری بھی رہے گی، یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب ایک ہی طریقہ بہترین ہوگا تو ہر تجربہ و خیال ایک ہی طریقہ سے بیان کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ دو تجربے کبھی ایک سے نہیں ہوتے، نہ دو شخصوں کے دو تجربے نہ ایک شخص کے دو تجربے، نہ ایک شخص کے ایک ہی چیز کے متعلق دو بار کے تجربے، احساس، تخیل، تجربہ بھی ہر شخص کا الگ ہوتا ہے اور ہر آن کا علیحدہ ہوتا ہے، اس لئے جتنے تجربے اتنے ہی ان کے بہترین اسلوب نہ تجربات کی حد نہ اسالیب کی انتہا۔

البتہ یہاں ایک اور پہلو قابل غور ہے، سر ڈینی سن راس نے ڈاکٹر اقبال کی وفات پر جو اظہار خیال کیا تھا (اور جو رسالہ اردو کے اقبال نمبر میں انگریزی عبارت میں شائع ہوا تھا) اس میں کہا تھا:-

"فارسی شاعری اگر اعلیٰ درجہ کی ہو تو وہ بذات خود ایک مقصد بن جاتی ہے اور ناظرین پر اس کے عملی پیغام کا اثر کم ہوتا ہے۔"

یعنی "شاعری برائے شاعری" ہو جاتی ہے۔ "برائے مقصد" نہیں رہتی

لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب اس مقصد اور پیغام میں جان نہ ہو ورنہ پیغام کی موزونیت، ضرورت اور قوت اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی، بہرحال اس صورت میں "ادب برائے ادب" کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کا کوئی اور مقصد نہ ہو، زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق نہ ہو، کوئی مادّی و غیر مادی نفع مقصود نہ ہو، گویا شاعر فطرت و قدرت دقائق و حوادث، تخیلات و جذبات سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتا ہے اس لئے کہ تاثر اس کی شاعرانہ فطرت کا تقاضا ہے، بہت سے مفکر اور نقاد، شاعر اور ادیب اس نظریہ کے قائل ہیں اور یہ بھی شاعروں کا ایک جدید رجحان ہے، میں اس نظریہ کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس نظریہ پر بعض شاعروں کے عمل سے مجھے اختلاف ہے۔

شدتِ احساس اور خلوصِ اظہار نہایت مبہم چیزیں ہیں، اس شدت و خلوص کی لفظوں میں کوئی تعریف یا حد بندی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کی ایک پہچان ہے یعنی "سننے والے پر اثر"۔ احساس بالکل ذاتی چیز ہے، کسی کے دل و دماغ میں کسی تصور یا کسی حادثہ سے کیا ہیجان برپا ہے، دوسرے کو اس کی خبر نہیں ہوتی، اس شخص کا بیان اس کے تاثر کو دوسرے تک منتقل کرتا ہے، بیان کا خلوص پھر ذاتی اور نفسیاتی شے ہے، کوئی بیان کتنا ہی سچا اور پر خلوص ہو جب تجربہ و تخلیق کے ماحول سے منقطع ہو کر یا کیفیات مخزوجہ سے علیحدہ ہو کر یا شاعرانہ اچھوتے پن سے خالی ہو کر نظم میں آئے گا تو ناظرین و سامعین پر وہ اثر نہیں کر سکتا جو خود شاعر پر کرتا ہے، مثال کے طور پر ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی نظم (عالمِ تنہائی) دیکھئے، یہ ان کی نظروں میں بہترین نظم ہے۔

وہ جس کے تبسم سے
کھلتی تھی کلی دل کی

وہ جس کے اشاروں پر
چلتی تھی گھڑی دل کی

ہے زیر زمیں پنہاں
دل اس کا مگر خواہاں
لیتا تھا کسی دن وہ
اسباب کی دنیا میں
آتا ہے نظر لیکن
اب خواب کی دنیا میں
آتے ہیں کبھی آنسو
آنکھوں ہی میں پیتا ہوں
جیتا ہوں جو تنہا میں
وہ خواب میں جیتا ہوں
ہے مہر، تو وہ بے رونق
ہیں دیدۂ تر اختر

گل جتنے ہیں گلشن میں
وہ خار ہیں یا اخگر
دنیائے حقیقت اب
اک یاس کی دنیا ہے
تنہائی کے عالم نے
اک راہ دکھائی ہے
"دل جاؤ گے تم اس سے"
یہ آس بندھائی ہے
اے عالم تنہائی!
اے عالم تنہائی!!
تو جذب کی دنیا ہے!
تو آس کی دنیا ہے!!

اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے پروفیسر کلیم الدین احمد کی نظم (نقش ابد) ملاحظہ ہو اس کو وہ اپنی بہترین نظم سمجھتے ہیں۔

نقش ابد

میں کنج عافیت میں
تھا عافیت بداماں
دل مثل گل تھا خنداں
شاخ طرب پہ رقصاں
اس کنج عافیت میں
(یہ کیا ہوا خدایا)

اب ہیں الم کے ساماں
دل ہے کہ شمع گریاں
سیماب وار رقصاں
اس کنج عافیت میں
اب عافیت کہاں ہے
وہ پھول جس کی نکہت
جاں تھی مرے چمن کی

وہ شمع جس سے زینت
تھی اپنی انجمن کی
نظروں سے اب نہاں ہے
اے پھول تو کہاں ہے ؟
اے شمع تو کہاں ہے ؟
یہ زندگی ہماری
اک آہ دم بدم ہے

گویا ہماری ہستی
صورت گر عدم ہے
اس آہ دم بدم کو
صورت گر عدم کو
اے صانع حقیقت
نقش ابد بنا دے
نقش ابد بنا دے

دونوں نظموں کی صورت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، قافیے ہیں بھی اور نہیں بھی، لیکن مجھے قوافی کے وجود و عدم سے بحث نہیں دو نظموں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے، ممکن ہے ایک ہی واقعہ کے دو تاثرات اور دو بیان ہوں، ان کے شدت احساس اور خلوص اظہار میں شک کرنے کا کسی کو حق نہیں لیکن دونوں کے اسلوب بیان میں کوئی شاعرانہ انوکھا پن نہیں اس لئے بے اثر ہیں۔

ایسا ہی تاثر ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کی ایک اور نظم میں ہے ممکن ہے یہ بھی اسی واقعہ کا اثر اور بیان ہو اس کو بھی دیکھئے۔

تھا درختوں کو ابھی عالم حیرت ایسا — جیسے دلبر سے یکایک کوئی ہو جائے دوچار
ڈالیاں ہلنے لگیں تیز ہوائیں جو چلیں — پتے پتے میں نظر آنے لگی، تازہ بہار
سنسناہٹ ہوئی جھونکوں سی ہوا کے ایسی — چھٹ گئی ہوں کہیں لاکھوں ہی ہوائی یکبار
رعد گرجا، ارے وہ دیکھنا بجلی بجلی — ہلکی ہلکی سی وہ پڑنے لگی بوندوں کی پھوار
رات تاریک ہے، آیا ہے امڈ کر بادل — میں اکیلا نہ کوئی یار نہ کوئی غمخوار
سرد جھونکوں میں ہوا کے ہے لطافت و دل — اس کا خواہاں ہے نہیں ملنے کے جس کے آثار
ایسی بے چینی خدایا نہ ہو دشمن کو نصیب — اس سے بدتر نہ کسی کو ہو الٰہی آزار

اس نظم کے مضامین اور خیالات کے ارتقا اور ترتیب کی طویل توضیح پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے اپنی تصنیف (اردو شاعری پر ایک نظر) میں کی ہے۔ اس پر مفصل تنقید کی ضرورت ہے کہ یہ تشریحیں اور تعبیریں اردو شاعری کے لئے بالکل نئی اور عجیب ہیں، لیکن محض جدید ہونے کی بنا پر قابل رد نہیں ہو سکتیں، جانچ تول کر ان کی قیمت لگانی چاہیئے، خیر یہ کام تو پھر کبھی ہوگا، اس وقت یہ کہنا ہے کہ پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی اس نظم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

> "یہ نظم جذبات کی اصلیت اور جوش اور حسن کارانہ بیان کی وجہ سے اعلیٰ پیمانہ کی شاعری کا بے مثال نمونہ ہے اور اپنی تکمیل کے سبب یہ جو سکون اور طمانیت قلب عطا کرتی ہے وہ کسی بہترین شعر میں بھی موجود نہیں"

لیکن مجھے کوئی حسن کارانہ بیان اور شاعرانہ تکمیل نظر نہیں آتی، نہ اعلیٰ شاعری، نہ بے مثال نمونہ، جذبات کی اصلیت اور جوش جو شاعر کے دل میں ہوگا اس میں شک کرنے والا کافر، لیکن اس جوش نے ان الفاظ میں سرایت نہیں کی، اگر ناظرین اس نظم کو پڑھ کر جھوم اٹھے ہوں اور مست ہو گئے ہوں تو میں ہی بے حس سہی غرض یہ پھیکی شاعری بھی اب بہت چل پڑی ہے۔

یہ اگر "پھیکی شاعری" ہے تو ایک قسم "مبہم شاعری" کی بھی انقلاب پسندوں نے شروع کر دی ہے، یعنی ساری نظم پڑھنے کے بعد یا تو کوئی مدعا و مقصود ہاتھ نہیں آتا یا صرف مرکزی خیال اور اصل مضمون تو مل جاتا ہے، لیکن خیالات کی کڑیاں مربوط نہیں ہوتیں۔ کنایہ و ابہام میں مطلب ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی اس نظم (رس بھرے ہونٹ) کو دیکھئے۔

رس بھرے ہونٹ
پھول سے ہلکے

جیسے بلور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس چھلکے

جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغوان قطرہ
شفقِ صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل ڈھلکے
رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں
یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راہی
پاؤں چھلنی نگاہ متزلزل!
وقت، ابھرائے بیکراں کہ جہاں
سنگِ منزل نشانہ آج نہ کل

دفعتاً دور — دور — آنکھ سے دور
شفقِ شام کی سیاہی میں
قلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک جھلک لٹکے
ایک دھوکا سرابِ منبعِ نور
رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تا بفر
رات دن تھکے ہوئے راہی
یوں ترستے ہیں یوں لرزتے رہے

اس نظم میں تشبیہ، ترکیب، تلفظ کی خامی سے قطع نظر کر کے بھی پورا مضمون مبہم و غیر واضح ہے، نظم مہمل نہیں ہے، شاعر کے تصور اور خیالات کی رفتار میں تسلسل پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن نمایاں نہیں ہے۔ "متزلزل" پنجابی تلفظ کے ساتھ نظم ہونا قابل اعتراض ہے۔ اس کو بدلا جا سکتا تھا۔ "بادہ" کی صفت "آتشیں نفس" ٹھیک ہے وجہ یہ ہے وہ موجِ شراب "کو "نفسِ آتشیں" کہہ سکتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی کچھ اور عرض کروں گا۔ پہلے ایک مبہم شاعری اور دیکھ لیجئے، پروفیسر فیض احمد فیض کی نظم (تنہائی) ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بےخواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!

یہ تنہائی کا تصور ہے۔ لیکن صاف و مسلسل نہیں۔ اگرچہ ن م راشد اس نظم کو "حسین اور انتہا درجہ کی اثر آفریں نظم" قرار دیتے ہیں۔ "خوابیدہ چراغ" کی ترکیب یہاں موزوں نہیں، "خاموش" کا مضمون ہوتا تو "خوابیدہ" درست ہو جاتا۔ "ٹمٹمانے" کے لیے غنودگی کی ضرورت تھی، "بے خواب کواڑوں" کی ترکیب مجھے بہت پسند آئی۔ یعنی اس مکان کے کواڑ جس میں اب تک خواب کا گذر نہیں ہوا، یہ انتقال صفت موصوف اصلی سے اس کے کسی متعلق قریب کی طرف اردو فارسی میں نامانوس نہیں ہے۔ لیکن انگریزی میں متعلق بعید کی طرف بھی انتقال صفت بہت عام ہے۔ اور نہایت معنی خیز ہو جاتا ہے۔ "بے خواب شخص" کی بجائے "بے خواب بستر" "بے خواب کمرہ"، "بے خواب مکان" مستعمل ہیں۔ "بے خواب کواڑوں" میں تجسّد زیادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن معنویت میں کوئی کمی نہیں آتی، میراجی کی کسی نظم میں تنہائی کو "تھکی سی تھکن" کہا گیا ہے۔ یہ استعارہ اور تشبیہ دونوں دلکش ہیں۔ تھکن میٹھی بھی ہوتی ہے۔ پھیکی بھی۔ تنہائی پھیکی تھکن ہے، انتظار محبوب کو میٹھی تھکن کہہ سکتے ہیں، پروفیسر فیض صاحب نے کسانوں کے افلاس اور خستہ حالی کے لئے اس شعر میں کیا خوب استعارہ کیا ہے۔

یہ جیسے کھیت کھپا پڑتا ہے جو بن جن کا   کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

غلہ پیدا کر کے بھی بھوکے رہتے ہیں تو ان کے لئے گویا کھیت بھوک ہی اُگتی ہے، اس نوع کا اسلوب۔ تخئیلی۔ ترکیب بلاشبہ شعر و ادب میں قیمتی اضافے ہیں، ان کو سمجھ کر اختراع و استعمال کیا گیا تو سکہ رائج بن جائیں گے۔

جن نظموں کو میں نے مبہم کہا ہے، ان کا یہ انداز ہے کہ شاعر ایک مضمون سوچتا ہے اور اس کو صاف و مبین الفاظ میں لکھنے کی بجائے استعارہ و کنایہ میں بیان کرتا ہے، ان کے لئے اصطلاحیں تجویز کرتا ہے، نشانات و علامات مقرر کرتا ہے

اور یہ سب کچھ صرف شاعر کے ذہن میں ہوتا ہے، بادی النظر اور ظاہر الفاظ سے نظم کا کچھ اور مطلب ہوتا ہے اور شاعر کا مقصود کچھ اور، یہ پیرایہ و اسلوب فی نفسہ درست ہے۔ نہ صرف درست بلکہ لطیف تر، اور بلیغ تر، اور کچھ جدید شاعری کی ایجاد بھی نہیں ہے، ہر زبان و ملک کی شاعری میں موجود ہے، لیکن وہاں وہ علامات و اصطلاحات معلوم و مقرر ہوتی ہیں، ہر شخص ان کے ظاہر و مخفی معنے سمجھ لیتا ہے۔ نئی نظموں میں اصل مقصود بطنِ شاعر میں رہتا ہے اسی لئے ابہام پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً شاعر یہ مضمون سوچتا ہے:-

"ہم غلامی میں مبتلا ہیں اور بے کس و مجبور ہیں، چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نمودار ہو کہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دے، کبھی ایسے آثار پیدا ہوتے ہیں لیکن مٹ جاتے ہیں، ہماری عمریں ختم ہو گئیں، ہماری تہذیب اور مذہب کا شیرازہ بکھر گیا، غیروں نے ہمارے اسلاف کے آثار مٹا دیئے اب نجات کی امید موہوم اور انتظار بے سود، اس حالت سے رہائی ممکن نہیں۔"

اور اس مضمون کو اس پیرایہ میں ادا کرتا ہے جو پروفیسر فیض احمد صاحب نے رتنہائی میں اختیار کیا ہے۔ اب وہ نظم دوبارہ پڑھ کر دیکھئے اس کے الفاظ سے یہ مضمون نکالا جا سکتا ہے اور یہ تعبیر میری نہیں، ن۔م۔ راشد صاحب کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شاید یہ نظم بھی کسی سیاسیات میں الجھے ہوئے لمحہ کی پیداوار ہو، کیا راہرو سے مراد کوئی نیا حملہ آور ہے؟ کیا تاروں کا بکھرتا ہوا غبار اور ایوانوں میں لڑکھڑاتے ہوئے چراغ، تہذیب اور مذہب کے بکھرے ہوئے شیرازہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور کیا اجنبی خاک

میں قدموں کے سراغوں کے دھندلا جانے سے شاعر کا یہ مطلب ہے
کہ اس سرزمین میں جہاں ہم صدیوں پہلے ایک ہنگامہ، ایک ہاؤ ہو
لے کر آئے تھے، آج اپنی ناگوار آب و ہوا اور اپنے ناپسندیدہ ماحول سے
ہمیں زوال آمادہ قوم بنا دیا ہے۔"

اگر اس نظم کا یہ مفہوم ہے تو ظاہر ہے کہ الفاظ اس کی طرف صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتے، اس کے علاوہ دوسری اور تیسری تاویل بھی ہو سکتی ہے اسی لئے یہ مبہم ہے لیکن اگر (بقول راشد صاحب) شاعر نے کوئی اداس اور غمناک شام بسر کرنے کا تجربہ بیان کیا ہے، تو نظم میں کوئی خاص تاثیر اور شاعرانہ خوبی نہیں ہے خصوصاً "اجنبی خاک" کے الفاظ بے معنی رہتے ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور اسلوب بھی نئی تخئیل کی بدولت وجود میں آیا ہے، اس پر کبھی مفصل لکھنے کا ارادہ ہے، اس وقت اختصار سے کام لیتا ہوں، یہ پیرایہ غزل جدید میں پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً اس شعر کو پڑھئے۔

دم لے رہی تھیں حسن کی جب سحر کاریاں   ان وقفہ ہائے کفر کو ایماں بنا دیا

اور اس کا مطلب سوچئے، شاعر کیا کہتا ہے؟ حسن کی سحر کاریوں کا دم لینا کیا؟ اور دم لینے کے لئے وقفہ ہائے کفر کیوں؟ اور ان وقفوں کو ایماں بنا دینا کیا سوچ لینے کے بعد خود شاعر کی مندرجہ ذیل تشریح پڑھئے۔

"کفر و ایماں کے الفاظ کافی فرسودہ ہیں، حسن کائنات و حیات کا
زندہ احساس کفر ہے یعنی وہ لطیف رنگینی نازک اور شدید دہریت
جسے لوگوں نے رکم از کم ٹیپا نے) کفر کہا ہے۔ یونانی پیگنیزم یہی کفر
ہے۔ لیکن اس حسن کا عکس تاریخ انسانی کے بعض دوروں میں شاید انسانی
کے آئینہ میں دکھائی نہ دیا۔ یہی وقفہ ہائے کفر ہیں۔ یعنی وہ وقفے جب

حسن کی سحر کاریاں گویا دم لیتی ہیں انھیں وقفوں میں آسمانی خدا کا مجلّہ
اور غلط تصور وحدت اور ایمان کے نام سے مرتب ہوا عیسائیت اور
رہبانیت اور زہد خشک کا دور ایمان اور مذہب کے نام پر قائم رہا
جب حسن سحر کار کا کفر نکھرتا ہوا عکس پھر تاریخ کے آئینہ میں پڑا تو ایک
نئے دہریت یعنی کفر کا نیا جنم شروع ہوا۔ دنیا میں پھر ایک مرتبہ
فلسفۂ دہریت جگمگا اٹھا۔ اسی حقیقت کی طرف اس مختصر شعر
میں اشارہ ہے۔
اب اس شعر کو پھر پڑھئے۔ کیسا بانکا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن کیا یہ بانکپن
تشریح معلوم ہونے سے پہلے بھی ان الفاظ میں تھا؟ یہی میرے نزدیک ابہام ہے
اس شعر کے مضمون پر مجھے تنقید کرنی نہیں ہے۔

کفر ان کو عزیز اور ایماں ہمیں
کل حزب بما لدیہم فرحون

یہ شعر پروفیسر فراق گورکھپوری کا ہے۔ مع تشریح رسالہ زمانہ کانپور میں
شائع ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی شاعری میں "تنقید حیات" کی کوشش کی
ہے۔ اور حقائق حیات وکائنات سے متاثر ہو کر شعر لکھتے ہیں، یہ بڑی ضروری،
بہت دلچسپ اور نہایت قابل تحسین چیز ہے۔ لیکن یہ چیز اگر غزل کے ایک شعر میں
ہو تو الفاظ کی دلالت واضح و صریح ہونی ضروری ہے۔ ورنہ شعر مکمل نہ رہے گا۔
دوسرے اسلوب بیان ہمیشہ شاعرانہ ہونا چاہیئے، ہر واقعہ سادہ پیرایہ میں بیان
ہونے سے دل کش و موثر نہیں ہوتا۔ مثلاً فراق صاحب کا یہ شعر دیکھیئے۔

دیکھ رفتار انقلاب فراق — کتنی آہستہ اور کتنی تیز

اس بیان میں کوئی شعریت، کوئی لطف، کوئی تاثیر نہیں اور شاعر کی اس تشریح

کے بعد بھی شعر ویسا ہی بے مزہ رہتا ہے۔ فراقؔ صاحب توضیح فرماتے ہیں۔

"مشہور عالم فرانسیسی شاعر رومان اولان نے انقلاب فرانس کے متعلق
ایک ڈراما لکھا ہے، جس میں ایک جگہ یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ انقلاب
فرانس ہونے کے چند لمحے پہلے تک جمہور کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ انقلاب
ہونے والا ہے۔ اس موقع پر اس ڈرامہ میں یہ ناقابل فراموش فقرہ
آیا ہے کہ انقلاب ہونے والا ہوتا ہے تو انقلاب سے زیادہ کوئی چیز
انہونی یا غیر متوقع معلوم نہیں ہوتی۔ یہ شعر اسی جملہ کے مطالعہ کا
اثر ہے۔ دوسرے مصرع میں اس زبردست حقیقت کی ترجمانی کی
گئی ہے "کتنی آہستہ اور کتنی تیز" "کتنی غیر متوقع اور کتنی قریب"۔

پہلا شعر شاعرانہ تخیل اور حسن بیان کی وجہ سے بہت خوبصورت ہو گیا تھا، دوسرے
شعر میں کوئی حسن نہیں اس لئے کہ فکر شاعر نے شائستگی نہیں کی۔ یہ شعر فرد ہونے کی
بجائے کسی نظم کا جزو ہوتا جس میں انقلاب کی آہستہ و تیز رفتار دکھائی جاتی تو اس
جگہ یہ شعر موزوں، برمحل اور پرلطف ہو جاتا۔

فراقؔ صاحب کا ایک اور شعر دیکھئے۔

مستی ہو یا خمار ہو، کر مے پرستیاں — بے سود رفعتیں ہیں، نہ بیکار پستیاں

اس کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اور یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ غزل کا ایک الگ شعر
ہے۔ دونوں مصرعوں میں باہم تعلق تلاش کیجئے، یہ مضمون ذہن میں آسکتا ہے
کہ دنیا کے بلند و پست کی پرواہ نہ کر، ہر حال میں مے پرستی کر، خمار میں تو پیتے ہی
ہیں تو مستی میں بھی پی کہ اور زیادہ غفلت طاری ہو جائے۔ لیکن "بے سود"
اور "بیکار" کے الفاظ اس مفہوم سے مانع آتے ہیں۔ پھر شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ اگر
شعر مہمل نہیں کہا تو مبہم کہا ہے۔ اور مفہوم فی بطن الشاعر ہے۔ چنانچہ خود پروفیسر

فراق صاحب کی تشریح دیکھیے۔

> ہستی رفعت اور خمار تا بلندی پستی ہے، انفرادی اور اجتماعی دونوں
> طرح کی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کا وہ توازن ٹوٹ
> جائے جو جمود کی طرح ہے "گرے پستیاں" تاکہ اس جمود کی بنیادیں
> ہل جائیں، نئی بلندیوں اور نئی پستیوں کا احساس ہو، زندگی میں
> انقلاب آئے، پھر اس چڑھاؤ اور اتار کو سمیٹتی ہوئی زندگی آب رواں
> کی طرح ایک نئی سطح حاصل کر لے گی۔

یہ مضمون شعر کے الفاظ سے ذہن میں نہیں آسکتا ہستی سے مراد رفعت اور خمار سے پستی ہو سکتی ا۔ سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن انفرادی یا اجتماعی زندگی کے جمود کا ٹوٹنا، نئی بلندیوں اور پستیوں کا احساس ہونا، زندگی میں انقلاب آنا اور زندگی کا ایک نئی سطح حاصل کر لینا، یہ باتیں شعر سے نہیں نکلتیں؛ جواب یہ کہ کسی قول کو سمجھنے سمجھانے کے لئے قائل و سامع میں پہلے سے ایک مفاہمت اور ایک سمجھوتا ہوتا ہے؛ قواعد صرف و نحو معانی و بیان و بدیع، محاورات و مصطلحات روایات و مفروضات، سب اسی سمجھوتے کی دفعات ہیں۔ متکلم ان اصولوں کے مطابق کام کرے گا اور مخاطب ان قوانین سے واقف ہوگا۔ تو کلام کا فائدہ حاصل ہوگا ورنہ نہیں، اب ہو سکتا ہے کہ شاعر نئے اشاروں اور جدید اصطلاحوں کو ایجاد کرے اور ان سے کام لے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ صرف یہ شرط ہے کہ سامعین کو وہ جدید اوزان و اصطلاحات پہلے سے معلوم ہو جائیں، ورنہ سامع کے نزدیک وہ کلام مہمل ہوگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چند احباب کسی عام لفظ کے خاص معنی مقرر کر لیتے ہیں یا کوئی نیا لفظ کسی مفہوم کے لئے گھڑ لیتے ہیں۔ ان دوستوں کی جماعت میں

وہ لفظ بے تکلف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال بس وہیں تک رہتا ہے مثلاً آگرہ کے بعض لوگوں نے ایک لفظ "مجردی" بنا لیا ہے یہ کسی زبان کا لفظ نہیں ہے، ایک صاحب جو انگریزی نہیں جانتے تھے انگریزی لفظ "بجاری" کو "مجردی" کہہ دیا تھا، دوستوں نے اس کو ایک اصطلاح بنا لیا لیکن یہ لفظ گویا صرف ایک سوسائٹی کے "کوڈ" کا لفظ ہے۔ آگرہ میں بھی اور لوگ اس کو نہیں جانتے، یا کبھی کسی شہر یا ضلع میں زبان کے عام لفظ کو کسی خاص مفہوم کے لئے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً آگرہ میں "دانہ" کا لفظ دانہ دار شکر" کے لئے بولتے ہیں۔ کہتے ہیں "ایک روپیہ کا دانہ بازار سے لے آؤ، چائے بن گئی ہے لیکن ابھی دانہ نہیں آیا"۔ ایک چھوٹا بچہ آگرہ سے مراد آباد گیا تھا، ایک روز میزبان نے اس بچہ سے کہا کہ باہر جا کر آدمی سے کہہ دو کہ دو روپیہ کی شکر لے آئے، بچہ نے آگرہ کی اصطلاح میں ملازم سے کہا کہ دو روپیہ کا دانہ لے آؤ۔ اتفاق سے صاحب خانہ کے گھر گاڑی گھوڑا تھا۔ نوکر گھوڑے کا دانہ بازار سے لے آیا۔

مقصود یہ ہے کہ کلام میں صنعت "ابلاغ" (کمیونیکیشن) سب سے ضروری چیز ہے، بات ایسے الفاظ اور پیرایہ میں کہی جائے کہ سننے والا سمجھ سکے، کلام کا دوسرا وصف "ایجاز" (اختصار) ہے۔ فن بلاغت کا ایک مقصد کلام میں ایجاز پیدا کرنا بھی ہے۔ اصطلاحات اور "تکنیک" بھی ایجاز ہی کی خاطر وضع کی جاتی ہیں۔ رموز و کنایات علامات ایجاز ہی کی صورتیں ہیں۔ لیکن ان کے مفہوم معلوم و متعین ہونے ضروری ہیں۔

پروفیسر فراق صاحب نے رموز و اشارات سے کام لیا ہے لیکن جن حقائق و نظریات کو بیان کیا ہے وہ خود ابھی ہندوستان اور اردو زبان کے

ارباب شعر و ادب میں شائع و معروف نہیں ہیں، عوام کا ذکر نہیں، خواص میں بھی بہت سے ان مسائل کو نہیں جانتے، اور جو واقف ہیں ان کے ذہن میں بھی ہر وقت یہ چیزیں اس طرح حاضر نہیں رہتیں کہ شعر پڑھتے وقت ان کی طرف انتقالِ ذہن ہو سکے اس لئے فراق صاحب کے یہ اشعار قبل از وقت ہیں۔ عصرِ حاضر اور نسلِ موجود کے لئے نہیں ہیں، لیکن اشعار شاعر کے کلیات میں ثبت و محفوظ رہنے چاہئیں۔ جو ہستیاں ابھی منتظرِ تخلیق ہیں، ان کے وجود میں آنے تک ممکن ہے یہ طرز و اسلوب اور یہ علوم و حقائق روزمرہ کی باتیں ہو جائیں اور شعر و ادب میں رمز و کنایہ کی دلالت ان مسائل کی طرف واضح و صریح ہو جائے۔

پروفیسر صاحب کے جس مضمون سے یہ اشعار و تشریحات نقل کئے گئے ہیں اس میں اُن کے پچاس شعر مع تشریح درج ہیں اور سب پر الگ الگ تنقید کی ضرورت ہے، اُن کے کلام میں تنقیدِ حیات بہت ہے اور خوب ہے، اس امر میں ان کو شعرائے عصرِ حاضر میں امتیاز حاصل ہے لیکن میرے نزدیک ان مضامین کے لئے جو شاعرانہ پیرایۂ بیان ہونا ضروری ہے وہ پروفیسر صاحب ہر جگہ پیدا نہیں کر سکے۔ بعض اشعار البتہ خوب نکل آئے ہیں۔ مثلاً

بچھڑ کے ہم سے اب اور ہی ڈھونڈیں دلیلِ راہ ‏ اتنی بلند گردِ رہِ کارواں نہیں

یہ شعر بغیر کسی خاص توضیح کے بہت ہی معنی خیز ہے۔ اور شاعر کی اس تعبیر کے بعد بھی۔

"گردِ رہِ کارواں کے بجائے کسی اور چیز کو رہنما بنانے کی ترغیب ہے کیونکہ ہر دور کو رہنمائی کے لئے نئی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے بنیاد و روش چاہتا ہے، ہر دور کو ایک نئی خود اعتمادی کی ضرورت ہے"

اور یہ شعر

انھیں بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا ‏ جو گل چمن کو مٹا کر کھلائے جاتے ہیں

پروفیسر فراقؔ تشریح کرتے ہیں :-

"اس شعر میں نعرۂ انقلاب بلند کیا گیا ہے، تخریب کے بغیر تعمیر ممکن نہیں ہے، اصلاح اور انقلاب میں فرق ہے۔ ارتقا کی مخصوص اور اہم منزل کا نام انقلاب ہے۔ "بہار" سے اس ظاہری چمک دمک کی طرف اشارہ ہے، جو امتدادِ زمانہ سے اب جھوٹی پڑ چکی ہے، اس مرگِ حیات نما کو مٹانے ہی سے وہ سچی زندگی حاصل ہوتی ہے جسے بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا۔ پھر کیا موجودہ جنگ چمن کو مٹا کر" کہیں نئے نظام کا تو گل نہیں کھلا رہی ہے "!

شعر اور تشریح دونوں لطیف ہیں، فراقؔ صاحب کی یہ کوششیں بہت کامیاب اور نہایت مبارک ہیں، شاعری میں اضافے اور غزل میں وسعتیں پیدا کرتی ہیں۔ فراقؔ صاحب دوسرے انقلابی شاعروں کے علی الرغم غزل کے دلدادہ ہیں۔ اور ایک شعر کے کوزے میں حقیقت کے دریا کو بھرنا چاہتے ہیں، یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ہو جائے تو شعر الہام کے درجہ میں آجاتا ہے۔

ان سب سے الگ ایک اور شاعرانہ تجربہ بھی جدید شاعری میں پایا جاتا ہے جو اگرچہ بالکل جدید نہیں ہے ہمیشہ سے موجود ہے تاہم عصر کے رجحانات کا حامل ہونے کے سبب سے قابلِ توجہ ہے، اس تجربہ کے جو نمونے اس وقت میرے سامنے ہیں وہ جناب احمد ندیم قاسمی کا نتیجۂ فکر ہیں۔ ان کی تعریف ڈاکٹر تاثیر کے الفاظ میں یہ ہے :

"انہوں نے شاعری اور افسانہ کو یکجا کر دیا ہے۔ ہر قطعہ ایک نظم بھی ہے اور ایک مستقل افسانہ بھی، گویا پرانی غزل اور نئی نظم کا ہر شعر ایک مکمل اور مستقل حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح ہر قطعہ اپنی جگہ قائم

ثابت ہے اگر تمام قطعات مل کر ایک نظم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں
ایک معین و مخصوص جذباتی فضا پیدا کرتے ہیں ۔ اور یہ فضا خاص
پنجاب کے دیہات کی فضا ہوتے ہوئے اپنے اندر ایک ایسی عالمگیر
جاذبیت رکھتی ہے کہ پردیسی کو کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔
جن حضرات نے ندیم صاحب قاسمی کے ان قطعات کا مجموعہ (دھڑکنیں)
نہیں دیکھا ان کو دو شعر کے قطعہ کے اندر نظم و افسانہ کی یکجائی کا اندازہ ندیم صاحب
کے اس قطعہ سے ہو سکتا ہے ۔

غلط اصطلاحیں

اسے بات بھی کہتے ہیں عام لوگ مگر — ہماری مست جوانی کا یہ جنازہ ہے
وہ بھرے جوں بھرے اشکوں کے چند چھینٹے ہیں — جو اس کے بھیگے ہوئے عارضوں پہ غازہ ہے

ندیم صاحب کے قطعات میں یہ نہایت خوبصورت اور مکمل منظوم افسانہ ہے
"ہماری مست جوانی" کے الفاظ میں شاعر اور اس کی محبوبہ کی تمام حیات معاشقہ کی
داستان آگئی، اس حیات کا انجام اور انجام کا تاثر دلکش و موثر شاعرانہ اسلوب
میں بیان کیا گیا ہے ۔
لیکن ڈاکٹر تاثیر نے یہ جو کہا کہ "تمام قطعات مل کر ایک نظم کی صورت اختیار کر لیتے
ہیں ، ایک معین و مخصوص فضا پیدا کرتے ہیں" تو حقیقت میں ایسا نہیں ہے قطعے
بہت مختلف مضامین کے ہیں اور بغیر کسی ترتیب کے جمع کر دیئے گئے ہیں ۔ بہت سے
قطعات ایسے بھی ہیں جو ایک معین و مخصوص فضا سے تعلق رکھتے ہیں اور انہی کی بنا
پر ڈاکٹر صاحب نے وہ رائے قائم کی ہے ۔ مگر ایسے قطعات یکجا نہیں ہیں ، تمام مجموعہ میں
منتشر ہیں ۔ سب قطعات پر ڈاکٹر صاحب کی تعریف لازم نہیں آتی ۔ مثلاً یہ چار قطعے

برابر برابر لکھے ہوئے ہیں۔

نگاہِ بلند

کس قدر ہے بلند میرا مقام — نقشِ پا ہے مرا یہ ماہِ تمام
عرش کے اس طرف ہے میرا وطن — میرے مذہب میں ہے یہ بھی حرام

در گذر

تجھ سے کس کو گلا ہو میرے رفیق — مدتوں سے ہے یہ جہاں کا طریق
فاش کرکے فریبِ زندیقی — بن گیا ہوں میں کافر و زندیق

بے وفا مرغا

گاؤں کے کوڑے پہ مرغے نے اکڑ کر دی اذاں — مرغیاں ڈربے میں گھبرائیں کہ جانے کیا ہوا
دوڑ کر آئیں مگر پل دیں یہ منظر دیکھ کر — اک نئی مرغی کے پہلو میں ہے وہ بیٹھا ہوا

انکھڑیوں کی زباں

دن ڈھلے کل گاؤں کے باہر چنے کے کھیت میں — میں نے دیکھا ایک دوشیزہ کو کچھ گاتے ہوئے
میری جانب دیکھتے ہی کانپ اٹھی، جانے لگی — انکھڑیاں کچھ کہہ گئیں موتی سے برساتے ہوئے

ان چار قطعوں میں پہلے دو قطعے افسانہ نہیں ہیں اور ان کو بعد کے دونوں قطعوں سے کچھ تعلق نہیں۔ ان سے مل کر کوئی مخصوص و معین فضا پیدا نہیں کرتے جیسے پہلے دو قطعے ہیں ایسے اس مجموعہ میں اور بھی ہیں، لیکن یہ اور وہ سب اقبال کے اسلوب کے بہت پھیکے خاکے اور دھندلے چربے ہیں۔ یہ ندیم صاحب کی شاعری کے متعلق

خیال پیدا نہیں کرتے اور ان کے دوسرے قطعوں کی فضا کو پیدا نہیں کرتے اور ان کے دوسرے قطعوں کی فضا کو خراب کرتے ہیں، بعد کے دونوں قطعات افسانے ہیں اور ایک ہی فضا سے متعلق ہیں، ندیم صاحب نے بعض جگہ اقبال کی نقل کے نقوش بہت بدرنگ کر دیے ہیں۔ جن سے ندیم صاحب کی سخن سنجی پر حرف آتا ہے، مثلاً ایک قطعہ لکھتے ہیں۔

بے خواباں

شبوں کو کنواریاں کتنی ہیں لیکن　　شبوں کو جاگنے والے کہاں ہیں
نشے جن میں غلامی کے ہیں پنہاں　　مری آنکھوں پہ وہ نیندیں گراں ہیں

دوسرے شعر کا مضمون کس قدر عمدہ ہے، لیکن سب سے پہلا مصرع اقبال کے طرز و اسلوب اور لب و لہجہ سے کس قدر بیگانہ ہے، یہ مضمون اس بازاری زبان کے علاوہ بھی کہا جا سکتا تھا۔

ندیم صاحب کے اور افسانوی قطعے دیکھئے۔

خوش آمدید

دھڑ دھڑاتے سے اسٹیشن پہ اک گاڑی رکی　　سینہ تانے اک جواں اترا ہے کس انداز سے
پاس ہی بوڑھی سی بیری کے تلے۔ اک خوبرو　　جھینپتی اوڑھنی سمٹتی اُٹھ رہی ہے ناز سے

ووٹ

دیکھنا اک بوڑھے دہقانی نے موٹر روک لی　　اک رئیس اترا ہے برساتا ہوا نخوت کی بھاپ
"کیا شکایت ہے"! وہ چلایا، وہ بوڑھا رو دیا　　"ووٹ لے لیتے ہیں اور روٹی نہیں دیتے ہیں آپ"

اس نوع کے قطعات جدید شاعری یا ندیم صاحب کی ایجاد نہیں ہیں، فارسی و اردو میں صدہا رباعیاں اور قطعے خیالی اور واقعی تجربات اور مشاہدات سے بھرے ہوئے ہیں، قدیم لوگوں کے علاوہ بھی اسمٰعیل و اکبر، اقبال و ظفر علی خاں، جوش وغیرہ نے ایسے قطعات کہے ہیں، تاہم ندیم صاحب کو اسی موضوع میں ایک خصوصیت حاصل ہے۔ ان کے اکثر افسانوی قطعے رومانیت لئے ہوئے ہیں جو ہمارے زمانہ کا خاص رجحان ہے، اور انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے تاثرات لے کر تخئیل کی مصوری کی ہے، لیکن تاثر ہو یا تخئیل، احساس ہو یا تجربہ اس کے اظہار و بیان میں جدت و ندرت لازم ہے۔ ورنہ عامیانہ وہ بے مزہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ندیم صاحب کا یہ قطعہ دیکھئے جس میں مشاہدہ، تاثر اور اظہار سب درست اور نادر ہیں۔

پردیسی کی ہیت

سن رہا ہوں دیر سے جنگل کی افسردہ صدا
اس صدا میں ایک چرواہی کا کھویا کھویا گیت
دل چرا کر ہائے! جاتے ہیں کیوں پردیسی
کتنی وحشتناک ہے ہم بیوفا مردوں کی ہیت

پاداش

رات بھر سینے میں اک بے نام سی الجھن رہی
رات بھر کرتی رہیں آنکھیں ستاروں کو شمار
کیا کسی زہرہ جبیں کو دیکھ لینا جرم ہے
اُف وہ ویرانہ، وہ چرواہی، وہ چشم میگسار

یہ واقعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر واقعہ کے بیان میں بھی ندرت نہ ہو تو شاعری کی حدود سے باہر رہتا ہے۔ اسی طرح کا ایک قطعہ اس سے بالکل مختلف موضوع کا دیکھئے۔

مجبور مفلس

لگان دوں گا اگر میرے پاس خاک نہیں ۔۔۔۔ کوئی سبیل میں دو روز میں نکالوں گا
غریب ہوں مگر اب گالیاں نہ دیجیے مجھے ۔۔۔۔ میں اپنی بیٹی کے دو بندے بیچ ڈالوں گا

یہ گاؤں کے صحیح واقعات ہیں لیکن ان کو اس طرح لکھ دینا شاعری نہیں ہے
بعض جگہ ندیم صاحب کے قطعات میں ابہام بھی ہے تاثر و تخیل واضح و متعین نہیں۔ مثلاً :-

دھندلی پگڈنڈی

شام کو کل اک مسافر نے کیا مجھ سے سوال ۔۔۔۔ "ختم ہو جاتی ہے اس وادی کی پگڈنڈی کہاں؟"
اُن دھندلکوں کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ۔۔۔۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا — "وہاں"

مسافر کے سوال نے شاعر کو کیا یاد دلا دیا؟ کیوں اس کی آواز بھرا گئی؟ جب تک کوئی اشارہ نہ ہو مضمون ناتمام ہے۔ کلام کی ضروری شرط "ابلاغ و ایصال" (کمیونیکیشن) فوت ہو گئی۔ اس لیے سامع اس سے ایسا متاثر نہیں ہو سکتا جیسا شاعر ہوا ہوگا۔ مبہم اشاروں میں بھی ابہام و ایضاح کے مختلف درجے ہوتے ہیں "وہاں" اور "کہاں" دونوں میں ابہام ہے جب تک مشار الیہ ذہن میں نہ ہو۔ اوپر کے قطعہ میں "وہاں" کے لفظ سے دھندلکوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن دھندلکوں کی "رمزیت" بالکل راز ہے۔ اس لیے مفہوم غیر واضح رہا "کہاں" کے لفظ میں بڑی معنویت ہے۔ اس کا ابہام بہت لطیف ہوتا ہے اس لیے کہ اس ابہام میں بھی وضاحتوں کا دفتر بند ہوتا ہے، دیکھیے اوپر کے قطعہ کا ہم مضمون یہ قطعہ ہے :-

بے منزل سفر

آسماں چپ تھا ہوا ساکن زمیں خاموش تھی — ایک ویراں راستے پر جا رہا تھا اک جواں
میں نے پوچھا اے مسافر کس طرف جائے گا تو — کانپتی آواز میں بولا "مری منزل کہاں"

اس "کہاں" میں ابہام کے باوجود وضاحت ہے، یعنی میں آوارہ ہوں بیکس ہوں، اس سے لطیف تر اور واضح تر "کہاں" اس قطعہ میں دیکھیے۔

جانے کہاں

لڑکیاں چنتی ہیں گیہوں کی سنہری بالیاں — کاٹتے ہیں گھاس منہ دھوئے ہوئے سو بانکے نوجواں
ایک لڑکی پست قد، بیری کی ہلکی چھاؤں میں — دیکھتی ہے گھاس پر لیٹی ہوئی جانے کہاں

"جانے کہاں" نہایت معنی خیز ہے۔ احمد ندیم صاحب قاسمی کے یہ شاعرانہ تجربے بہت خوب ہیں اور اپنی فضا کے سبب سے بالکل جدید ہیں۔ لیکن اسلوب بیان میں شاعرانہ ندرت کا ہر جگہ لحاظ رکھنا چاہیے۔ میں اس کے متعلق اوپر بحث کر آیا ہوں۔ کہیں کہیں نئے شاعروں کے کلام میں الفاظ کے صحیح تلفظ اور اصول عروض سے بے پروائی نظر آتی ہے، یہ چیز (۱) ہلکی اور عجز شاعر کے علاوہ تاثر میں بھی فرق پیدا کر دیتی ہے۔ نئی شاعری کے لیے جب تک نیا عروض اور نئی گرامر تیار نہیں ہوتی، پرانے قواعد کی پابندی ناگزیر ہے، انگریزی کی کسی نظم میں کوئی لفظ غلط تلفظ کے ساتھ نہ ملے گا۔ لیکن اردو میں ڈاکٹر تاثیر اور احمد ندیم قاسمی جیسے ادیب و شاعر پروا نہیں کرتے، ندیم صاحب کی بے نیازیاں دیکھیے۔

(۱) "غائب ہو جائے کہیں میری غزل گاتی ہوئی" (دھڑکنیں صفحہ ۲۲)۔
اس میں "ہو جائے" کی (ے)، یا "غائب" کی (ب)، غائب ہو جاتی ہے۔

(۲) "گرم راتوں کا حبس، سانپوں کا ڈر، جھینگوں کا شور" (صفحہ ۵۰)
(۳) "کس کی سانسوں کے لمس سے مرے لب جلتے ہیں" (صفحہ ۹۰)
"حبس" اور "لمس" میں دوسرا حرف ساکن ہونا چاہیے، یہاں متحرک نظم ہوا ہے۔

انقلابی شاعری اور آزاد نظم کے یہ چند رجحانات ہیں جن کا میں نے مختصر تجزیہ کیا ہے۔ سب کا احاطہ کرنے اور ایک ایک رجحان پر نقد و نظر کرنے کے لئے ایک تالیف کی ضرورت ہے، جیسا کہ میں پہلے چند بار کہہ چکا ہوں۔ میرے نزدیک شاعری ہر حالت میں شاعری ہونی چاہیے، خواہ "برائے ادب" ہو یا "برائے مقصد"۔ دورِ جدید اور عصرِ حاضر میں مقصدِ انقلاب کے لئے بھی شاعری نہایت کارگر چیز ہے، لیکن قوم و ملک اور شعر و ادب دونوں کے کچھ آداب و حقوق ہیں، ان کی حفاظت کے بغیر نہ انقلاب مفید، نہ شاعری۔

نیا ادب میری نظر میں

خواجہ محمد شفیع دہلوی

فارسی کی ایک مثل ہے۔ "خشک بہ بروزہ گندہ اگرچہ گندہ وے ایجاد بندہ" جدید ادب بھی اسی قبیل کی ایک حرکت ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں منظرِ عام پر آنے کی ہوس تو ہوتی ہے مگر صلاحیت نہیں پس وہ نئے نئے روپ دھار کر حلیہ بگاڑ کر سامنے آتے ہیں کہ شاید اسی ڈھب سے نظروں میں آئیں۔ انہیں جان لینا چاہئے کہ اس طرح اہلِ نظر کی نظر پر چڑھ نہیں سکتے۔

اکثر بازاروں میں لوگ اللہ ہُو کے چیلے بنے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہوس کارفرما ہوتی ہے۔ محلّوں میں آج بھی آپ کو لوگ ملیں گے جو زبردستی اپنی کوئی نہ کوئی چڑ بنا لیتے ہیں۔ اگر سیدھے سبھاؤ رہیں تو گلی میں کوئی انہیں جانے بھی نہیں اس طرزِ عمل سے بچہ بچہ اُن سے واقف ہو جاتا ہے۔ اور گلی میں آکر آپ اگر اکرام اللہ پوچھیں تو کوئی نہیں بتا سکے گا۔ ہاں گلاب جامن۔ قلاقند۔ شروہ چپاتی کہکر کسی سے دریافت کرلیں ان کے گھر تک پہنچا آئے گا۔

جب ہندوستان میں انحطاط اپنی آخری منازل طے کر رہا تھا اور منظرِ عام پر آنے کی راہیں عام طور پر مسدود ہو چکی تھیں تو لکھنؤ میں بانکے پیدا ہوئے — انگرکھے کی ایک آستین غائب ہے۔ گرمی کا موسم ہے اور یہ اوچھی بنے چلے جا رہے ہیں۔ انہی ہتھیاروں سے اپنے لئے راہ بنا رہے ہیں۔ آدھا لباس سرخ ہے

آدھا سیاہ اپنا رنگ جمانے کو چیپ گڈّی کا رنگ اختیار کیا ـــــــ دلّی میں
مرزا چُپ چُپ ـ سرخاب شاہ اور بندوق بردار نے جنم لیا ـ ان میں سے پہلے
کی یہ خصوصیت تھی کہ ہر فقرہ کے بعد چُپ چُپ کہہ دیتے تھے ـ دوسرے
سُرخاسرخ جوڑا پہنے بیر بہٹی بنے پھرتے تھے ـ آخرالذکر کے کندھے پر سدا
بندوق دیکھنے میں آئی ـ

بزمِ شاعری میں میرؔ و سوداؔ کے سامنے جب لوگوں نے اپنا چراغ جلتا نہ
دیکھا تو کوئی چرکین بن گئے ـ کوئی جان صاحب ـ کوئی ہدہد ـ خواہش نمود و نمائش
ان غریبوں کو نچا رہی تھی ـ اپنی ذات میں کوئی جوہرِ قابل تھا نہیں جو صفِ اوّل
میں لا کھڑا کرتا ـ یہ کمی تماشہ بن کر پوری کی جا رہی تھی ـ

ہندوستان میں نوشت و خواند پہلے کی نسبت عام ہوئی نقادوں کی
جماعت تھی نہیں ـ قصرِ ادب کا دروازہ ہر اہل و نا اہل پر یکساں وا تھا نہ کوئی دربان
نہ بوّاب جس کا دل چاہا بے دریغ چلا آیا سب سے بڑا سرہنگ عوام کا مذاق
سلیم کہیں دور دور نظر نہ آتا تھا یہاں اس بارگاہ میں سب آئے اور دراتے ہوئے
آئے ـ یہی حال تا حال موجود ہے ـ

ہم ادب جدید کو صرف نظر کرتے اور یہ اپنی فطری موت مر جاتا جس طرح
چرکین اور زٹلی نہ رہے ـ لیکن نوشتہ بماند سیہ بر سپید ـ وقت یہ ہے کہ اس کے
بے ڈھنگے نقوش سینۂ قرطاس پر رہ جائیں گے اور آنے والی نسلیں تصور کریں گی
کہ اس دور کے اہل ادب نے اسے ادب تسلیم کر لیا تھا اس لئے لازم ہوا کہ
دیدہ ور اپنے خیالات اس برساتی پیداوار کے متعلق کاغذ پر چھوڑ جائیں تاکہ
ہمارا دور اس داغِ بدمذاقی سے مامون رہے ـ

ادب بذاتِ خود دماغ انسانی کا ایک زندہ کارنامہ ہے اور ہر زندہ چیز میں

قانونِ قدرت کے تحت ہمیشہ جدتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں پس ادب کے ساتھ جدید لگانا گورا چٹا انگریز اور کالا بھٹ حبشی کہنے کے مترادف ہے اور تحصیل حاصل۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جدید ترکیب اختراع کیوں کی گئی۔ فطرتِ انسانی ہے کہ وہ اپنی کمی کو کسی نہ کسی عنوان چھپاتا ہے۔ اگر کوئی ملازم کمرے کی صفائی ٹھیک طرح نہیں کر رہا اور آقا آن کر کچھ کہے تو اس کے منہ سے فوراً یہ فقرہ نکلتا ہے۔
سرکار صفائی کر تو رہا ہوں۔ دل میں چور تھا وہ زبان پر بشکلِ عذر آ گیا۔
حقیقت یہ ہے کہ جو تحریر زدہ صحیح معنوں میں ادب پیش کرنے کے اہل نہیں ان کی طبع معذور نے یہ ڈھونگ رچایا ورنہ ابتدا سے اب تک ادب اپنے عنوانات بھی بدلتا رہا ہے اور طرزِ نگارش بھی۔ لیکن کسی نے یہ خطاب اپنے لئے نہیں تراشا
اکبر الہ آبادی نے حالات کے تحت ضرورت کے مطابق اردو ادب میں ایک نئی عمارت کی بنا ڈالی لیکن اس کے سنگ بنیاد پہ جدید نہ لکھا۔ حالی نے اردو شاعری میں بالکل نیا رنگ اختیار کیا لیکن اپنے کلام کو کسی صفت سے متصف نہ کیا۔ سرسیّد نے اردو نثر کا رنگ بدل دیا لیکن کہیں سرخ سیاہی سے لفظ جدید تحریر نہ فرمایا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری میں نئی راہ پیدا کی لیکن سنگِ راہ پر جلی حروف میں جدید نہ لکھا۔
ایک ادیب اور شاعر ماحول کا اثر لیتا ہے اور نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ چونکہ حالات بدلتے رہتے ہیں اسی لئے ادب بھی بدلتا رہتا ہے اور بڑی حد تک غیر ارادی طور پہ فطرتاً بدلتا رہتا ہے۔ لیکن جو نااہل ادب کا چولا زیبِ بر کر لیں وہ اس تبدیلی کے ڈھول پیٹتے ہیں اور ہوتے ہیں اندر سے خالی۔
یہ راہ اس نمائش زدہ دماغوں نے تراشی جن کے اپنے پاس کوئی راہ نہ تھی دوسروں کی بنائی ہوئی ڈگر پہ چلنے لگے چونکہ قدم اس راہ سے آشنا نہ تھے

اس لئے ٹھوکریں کھاتے لڑکھڑاتے نہایت بدنمائی سے گامزن ہوئے۔
ہوا یہ کہ انگریزی زبان کی تعلیم ایک طبقہ میں رائج ہوئی۔ ان لوگوں نے قلم اُٹھایا اپنی گرہ کا کچھ تھا نہیں یورپین شورٹ اسٹوریز لیں اور چربہ اتارنے خاکہ اُڑانے شروع کئے۔
اوّل تو کلّی جدید لذیذ دوسرے غیر زبان سے سرقہ ہیں گرفت کا کم اندیشہ تھا مزید برآں پکا پکایا مل گیا۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا یہ وکان لگا بیٹھے مال کی کمی نہ تھی خیر سے دوسروں کے دماغوں کا تمام متاع انہیں ورثہ میں مل گیا۔
چہ دلاوراست دُزدے کہ بکف چراغ دارد۔ ان کو ادبا اور شعراء پر یہ اعتراض ہے کہ وہ پرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں اور چبائے ہوئے نوالے چبا رہے ہیں یہ آخری فقرہ انہیں بہت مرغوب ہے اور وقت بے وقت اس کی جگالی کرتے رہتے ہیں اول تو یہ محض غلط ہے اور صرف برائے اعتراض اپنی بائی دوسروں پر گنوائی جارہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہم حافظ و سعدی و دامغانی کی بنائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں تو جناب تو جناب رنلڈز اور ... تھ اور شکسپیر کی آش نگل رہے ہیں۔ نیز ہم مستحسن تقلید کر رہے ہیں اور آپ میں سے اکثر و بیشتر سرقے کے مرتکب ہیں۔ آپ کی دُزدکاریاں محض اس وجہ سے نہیں کھلتیں کہ انگریزی کے لٹریچر پر عام رسالے پڑھنے والوں کی نگاہ نہیں ہے نیز جو ادھر وقت دیتے ہیں وہ اُدھر کم اعتنا فرماتے ہیں۔
علاوہ بریں آپ کے کشکول شاعری میں بھی وہیں کے چند رد کردہ ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں جس کی بابت انشاء اللہ آگے عرض کیا جائے گا۔
جدید ادب کے حامیوں میں ایک خاص بات ہے کہ ان میں سے آپ اگر کسی ایک کو زیر تنقید لائیں تو دوسرے فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ جدید ادیب نہیں ہیا

انجام کار ان میں سے ہر ایک دوسرے کے خلاف تبرا کرتا ہے۔ اب پہلے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کون کون مستند جدید ادیب ہے اور کون کون برادری باہر۔ جب تک ان کی پنچایت یہ طے نہ کرے اُس وقت تک ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ جو بھی اپنے آپ کو جدید ادب کا علم بردار کہے اسے اسی صف کا ایک تصور کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ذرا ان خصوصیات پر نظر ڈال لیں جو جدید ادب سے مختص ہیں اور اسے ادب حقیقی سے جدا کرتی ہیں۔

۱۔ عریاں نگاری

۲۔ الحاد

۳۔ غلاظت پاشی

۴۔ روسی نظام کی تبلیغ

عریاں نگاری کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ ایک پرچہ جو ادب جدید کا سب سے بڑا علم بردار تھا اور ایک عرصہ سے ہمارے نوجوانوں کے جذبات بھڑکا کر اپنا پیٹ پال رہا تھا۔ ادب سے دلالی کا کام لے رہا تھا۔ عریاں نگاری کی زد میں آگیا۔ سنا ہے کوئی نہایت پسماندہ افسانہ طبع فرمایا تھا جس کی بو پنجاب گورنمنٹ کی ناک تک بھی پہنچ گئی حالانکہ اسے کبر و بے اعتنائی کے زکام نے ایک عرصے سے بند کر رکھا تھا۔ کچھ ایسی ہی دماغ پاش بدبو ہوگی جو بیچ سویا ہوا ہندوستانی اخلاق کا محافظ چونک پڑا ورنہ چھپنے کو تو انہی گندہ قلم کا لکھا کیا کچھ نہیں چھپا۔

ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ جب ایک زد میں آتا ہے تو دوسرا جدید نگار اس سے برئیت جتاتا ہے اس لئے ہم نے اس پرچہ ہی کو لے لیا جو اس جماعت کا مخصوص آرگن مانا جاتا تھا۔

اس اعتراض کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں ہاں جواز میں دلائل بے شک پیش کئے جاتے ہیں اول تو یہ کہ قدیم لٹریچر میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا ــــــ بندہ نواز یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ اگر جناب کو ذرہ برابر بھی اُردو ادب میں نگاہ ہو تو نظر آجائے گا کہ اس کی حیثیت آسٹے میں نمک سے زیادہ نہیں نیز سماج اس پر سرکہ جیسی نظر آتا ہے اسے سراہتا نہیں۔ آپ سے طرۂ امتیاز سمجھے ہوئے ہیں اور ترویج دینے پر کمربستہ۔

دوسرا عذر یہ ہے کہ ہم چھپی ڈھکی بات کے قائل نہیں جو کچھ ہوتا ہے صاف صاف بے لاگ لپیٹ کہتے ہیں ــــــ حضور انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے جو جس سے آپ دور کرنا چاہتے ہیں اول الذکر تسطر حال کا قائل ہے اور دوسرا عریانی زدہ اور یہی ہم میں اور آپ میں عنوانِ افتراق ہے۔

کسی شخص کا داماد آتا ہے۔ ایک تو کہتا ہے آپ کے خویش آئے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے تمہارے داماد آئے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے تیری لڑکی کا خصم آیا ہے۔ چوتھا جناب کا ہم مشرب اس سے بھی زیادہ ننگے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

اب فرمائیے تہذیب و تمدن کے زرّیں ادوار میں سے گذر رہنے کے بعد ہم اگر دورِ برہنگی کی طرف واپس جائیں تو کونسی سمجھداری ہے۔ ع

"بریں عقل و دانش بباید گریست"

جناب انسان مکلف ہے بنا براں تکلفات اس کی سرشت ہم واحد کے لئے جمع استعمال کرتے ہیں۔ آپ آئے۔ آپ تشریف لے گئے۔ اب فرمائیے یہ تو صاف حقیقت کے خلاف ہے اور جناب ٹھہرے جناور ی حقیقت پرست تو آئندہ سے تو کا استعمال فرمایا کریں اور پھر دیکھیں محفل میں آپ کا کیا حشر ہوتا ہے لیکن جناب ایسا کریں گے نہیں اس لئے کہ آپ کی حقیقت پرستی برائے

حد تک ہے جہاں تک فائدہ ہو اپنے عقائد کے تحت نقصان اٹھانے کی جرأت جناب میں نظر نہیں آتی۔

بہر نوع یہ تو وہ عذر ہیں جو یہ حضرات بدتر از گناہ کے طور پر پیش فرماتے ہیں لیکن یہ عریاں نگار یہاں اصلی وجوہ پر پردہ ڈال گئے۔ قوم کی ماں بہنوں کے سامنے انتہائی مخرب اخلاق برہنہ مناظر پیش کرنے والے نے اپنے وقت پر لحاف اوڑھ لیا

اب ذرا ہم کو بھی حقائق بیان کر لینے دیجئے۔ محولہ بالا عذر تسخر حال و پردہ پوشی کے لئے ہیں حقیقت میں کچھ اور دبدبہ کے تحت یہ جانتے بوجھتے سمجھ کر رہے ہیں۔ ورنہ اگر یہ ایسے ہی حقائق آشکار ہیں تو بجائے عریاں نگاری کے خود ننگے کیوں نہیں پھرتے۔ یہاں حقائق پر لیٹے ململ کے گھونگھر دبار کمر خلاف کیوں چڑھا رکھے ہیں۔ سماج کے پردے چاک کرنے والا ہاتھ پہلے اپنا گریبان کیوں نہیں چیر ڈالتا۔ قوم کی ماں بہنوں کو صفحۂ قرطاس پر عریاں لانے والا اپنا بند قبا کھول کر سر بازار کیوں نہیں آتا۔

بات یہ ہے کہ ننگے پھرنے میں ان کا ذاتی کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان یقینی ہے اور عریاں نگاری میں فوائد ہی فوائد۔

اول تو نوجوان ناسمجھ طبقہ اسی قسم کی چیزیں زیادہ شوق سے پڑھتا ہے۔ ان کی جیبیں بھرتی ہیں۔ نیز عریاں لکھ کر قدرے ان کے منفی جذبات کی بھی تسلی ہو جاتی ہے۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ ساری عریاں نگاری ایک طرف تو حیلۂ منفعت کے لئے ہے اور دوسری طرف خواہشی تخیل WISHFUL THINKING کے تحت۔

اگر ان میں سے کوئی کسی عورت کو سر راہ دیکھتا ہے کوتاہ آستین اس

تنگ دست رس تو رکھتا نہیں خیالی پلاؤ پکانے شروع کر دیتا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں قدرے مسکرا دیا اس کے لب بھی متبسم معلوم ہوتے تھے۔ میں نے رفتار کم کی وہ برابر سے نگہ غلط انداز ڈالتی ہوئی گذری۔ اب اس نے آہستہ خرامی سے کام لیا اور میں رست سیمیں کو مس کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اور ایک سنسان گلی میں جہاں قدرے اندھیرا بھی تھا داخل ہو گیا وہ بھی آئی اور بصد ناز آئی اب تخلیہ کی ملاقاتیں ہیں اور بخت کی باتیں ہیں —— مرزا سودا کو جب کسی پر غصہ آتا تھا تو وہ کہتے تھے۔ لائیو غنچہ میرا قلمدان اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ ان کو جب کوئی عورت نظر آتی ہے تو یہ گھبرا کر کہتے ہیں۔ لائیو غنچہ میرا قلمدان میں اپنے دل کی نکالوں۔

اب ذرا الحاد نگاری کی بابت بھی سن لیجئے۔ اوّل تو ذرا اچھوتی سی بات ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ اللہ میاں کے منہ آ رہے ہیں۔ جن سے ان کے بزرگ تک ڈرتے تھے ان کا یہ چھوٹ جیدار مذاق اڑا رہے ہیں —— ہر ابنِ آدم میں یہ جذبہ ہوتا ہے کہ اپنا تفوق قائم کرے اور وہ اکثر دوسرے کو برا کہہ کر کسی کا مذاق اڑا کر اس جذبہ کی تشفی کرتا ہے۔ جو مرد ہیں وہ یا تو اسے دبا سکتے ہیں یا کسی ترکی بہ ترکی جواب دینے والے کے مدِمقابل آتے ہیں۔ یہ الحاد نویس اپنے کہنے کے مطابق وجود خداوندی کے قائل نہیں اس لئے اس جانب سے جواب دندان شکن کا انہیں اندیشہ نہیں پس اس امون طریقے سے دل کی نکال لیتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ بیوقوفی اور بدتمیزی قابل افسوس و نفرین ہے۔ صاحب جس چیز کا جناب کی رائے میں کوئی وجود ہی نہیں اسے برا کہنے میں اپنا وقت ضائع کرنا ایسی ہی جہالت ہے جیسے کوئی بیٹھا عدو کا کو برا بھلا کہتا رہے۔۔ یا یہ محمد شاہ رنگیلے کی سی طفل تسلی ہے کہ جب نادر شاہ کے پہنچنے کی اطلاع دربار میں وصول ہوئی تو طبلہ پر تھاپ پڑی

اور اس کے بول تھے۔ النادر کل معدوم۔

بدتمیزی کا پہلو اس میں یہ ہے کہ کوئی معقول آدمی کسی کے باپ کو اس کے روبرو بُرا نہیں کہتا۔ خواہ وہ بُرا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ بیٹے کو باپ عزیز ہوتا ہے اور احترامِ جذبات کے تحت اس حرکت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ ایک خدا پرست کو سب سے زیادہ جو ہستی عزیز ہے وہ ذاتِ پاک ہے لیکن یہ بنیادی اخلاق سے ناآشنا اس کا لحاظ نہیں رکھتے پھر لطف یہ ہے کہ یہی جب خدا پرستوں کی پاپوش کاری میں آتے ہیں تو خانۂ خدا ہی میں پناہ تلاش کرنے جاتے ہیں یہ واقعہ ہے افسانہ نہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر صرف فیشن کی خاطر الحاد فرماتے ہیں ورنہ "بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا"

غلاظت پاش۔ ان کی تحریر کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ اس وقت تک معیار پر پوری نہیں اُترتی جب تک اس میں گندی نالیوں۔ بدبودار بالوں اور پوشیدہ امراض کے جراثیم کا ذکر خیر نہ آئے۔

انہی میں سے ایک صاحب کا بدبو پرست دماغ تو اسی حد پر آگیا ہے کہ انہیں روزمرہ کی زندگی میں بھی خوشبو کی نسبت بدبو مرغوب تر ہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ میری حسین بیوی جج کی لڑکی میرے قریب برہنہ محوِ خواب تھی اور عطرِ حنا فضا کو معطر کر رہا تھا لیکن میرے لئے اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی مجھے گھاٹن کی بغلوں کی بساندیاد آرہی تھی۔ جناب ایک ماہر نفسیات کے لئے فطرتِ معکوس کا بہترین نمونہ ہے۔ سچ ہے گندگی کا کیڑا وہیں خوش رہتا ہے۔ پھوٹ گئی تقدیر غریب جج کی لڑکی کی بھی جو جناب کی خیالی جورو بنی۔

اس گندگی اچھالنے کا عذر یہ ہے کہ دنیا میں گندگی ہے پھر ہم اس کا ذکر کیوں نہ کریں ——— بجا ارشاد ہوا جناب کی رائے پر اگر عمل کیا جائے تو گھروں

راحت خانہ بجائے ایک طرف بنانے کے اور اس کا دروازہ بند رکھنے کی جگہ بیچ انگنائی میں بنائیں اور باہر آنے والے کو پہلے وہاں جھکائیں اور کہدیں صاحب یہ بھی حوائج حیات میں سے ہے۔

بند ہ نوانہ اہلِ ادب کا کام یہ ہے کہ سب کچھ کہہ جائیں اور پھر بھی حدِ ادب سے نہ گرنے پائیں۔ لیکن تو اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہیں مثلاً مرثیہ نگاروں نے کوفیوں کی فوج کے مرعوب ہونے کو ہزاروں طرح سپردِ قلم کیا لیکن یہی کام جب حضرت چرکین کے سپرد کیا گیا تو ظالم یہاں بھی گندہ نگاری سے باز نہ رہ سکا رنگ طبع اپنا رنگ دکھا گیا یہی کیفیت مقرر کی ہے ——— اہلِ قلم پوشیدہ امراض کے نقشے بھی سو سو طرح پیش کر سکتے ہیں۔ نفسیاتی اثرات پیدا کرنے پر قادر ہیں ذہن میں ایک فضائے گریز پیدا کر سکتے ہیں۔ اور پیپ ٹپکتی ہوئی دکھانے کی ضرورت نہیں ہوگی ——— ادیب میں اور آپ میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ ذہنی اثرات سے کام لیتا ہوا دل و دماغ پر نشتر کاری کرتا گزر جاتا ہے اور حضور جسدِ متعفن میں گھرے رہتے ہیں۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔

چوتھی علامت جو اس مرض میں پائی جاتی ہے وہ روحی نظام کا بحران ہے... جس طرح مریض اپنے مرض سے واقف نہیں ہوتا اسی طرح یہ غریب بھی روحی نظام کو جانتے نہیں لیکن ہیں اس میں مبتلا۔ پھر طرہ یہ کہ مرض کی دوا بھی جہر سے خود ہی تجویز کی ہے اور وہ بنتِ عنب ہے ——— یہ غریبوں کے غم میں خونِ جگر نہیں پیتے بلکہ بیس روپے کی بوتل اپنے اندر الٹ لیتے ہیں۔ بعدہٗ اسراحت زدہ طبقہ امرا پر جو تحفہ آتا ہے اس کی جھونجل میں حسن فروش عورتوں کی بوٹیاں چباتے ہیں یوں سمجھیے کہ ان کا تجویز کردہ نسخہ یہ ہے کہ خونِ انگور ہمراہ لحم آدم صبح شام بخورند ——— ان میں سے ایک صاحب انگریز عورتوں سے غلامی کا بدلہ

لینے کے مستحق ہیں اور اُن کے خون کے پیاسے ماشاء اللہ کیا ہمت مردانہ ہے اب یہ بھی سن لیجئے کہ یہی صاحب اسی گورنمنٹ کے پروپگنڈا ڈپارٹمنٹ میں ملازمت بھی کرتے ہیں۔ اقوال کیا ہیں اور افعال کیا۔

ان میں سے اکثر و بیشتر نے صرف اصطلاحات طوطے کی طرح حفظ کر رکھی ہیں اور موقع بے موقع اُگل دیتے ہیں ـــــ دراصل یہ حضرات اس سلسلہ میں اس لئے منسلک ہیں کہ یہاں جواز عام کی وسعتیں نصیب ہیں، اس حلقہ میں داخل ہوتے ہی لائسنس یعنی رخصت ہر عمل مل جاتی ہے۔ انہیں اور کیا چاہئے۔

یہ غریب بھی کیا کریں کم بخت غلامی کی گراں بار زنجیروں سے گھبرا اٹھے ہیں۔ وہ تو ان کے نازک ہاتھوں سے ٹوٹ نہیں سکتیں۔ اب آخر اس جذبۂ شکست و ریخت کو کہیں نکالتے بھی بس مذہب اور اخلاق کی زنجیریں توڑ پھینکیں کچھ تو بوجھ کم ہو گیا ـــــ یہ اتنا نہیں جانتے کہ غیر حکومت کی زنجیریں تو صرف ان کے جسم پر مسلط ہیں یہ روسی رسیاں ان کے دل و دماغ جکڑ رہی ہیں۔ ان کی ذہنی غلامی کی یہ حالت ہے کہ جب تک روس اس جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا اس وقت تک ہتھیار اٹھانا ان کے لئے حرام تھا جس روز روس نے اعلان جنگ کیا ان پر بھی فوراً جنگی صحیفہ اترا۔

جب ان کی جسم پرستی، جنسی تشنگی اور عریاں جذبات کے برہنہ اظہار پر اعتراضات کئے جاتے ہیں تو یہ بھی جواب ملتا ہے کہ "چند مہینے جدید ادب پر ایسے ضرور گزرے جب ہمارے فن کاروں کا سیاسی تخیل انقلاب کے رومانی تصورات کا حامل ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر یہ بات گئی گذری ہو چکی اب ہم زندگی کو محدود نہیں بلکہ ہمہ گیر نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔

جب ان ارباب زور تلون کو جواب بن نہیں پڑتا تو الفاظ کا گورکھ دھندا پھیلاتے ہیں جیسا کہ اس جملہ سے ظاہر ہے اور ان لفظی بھول بھلیوں میں گھس کر معترض کے تعاقب سے بچنا چاہتے ہیں نیز مندرجہ بالا فقرہ کے تحت اس ادب کی رفتار نمو ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "چند مہینے ایسے گذرے" لیکن پھر بانا بدل لیا اور دوسری منزل میں جا پہنچا۔ بس یوں سمجھئے چند گھنٹوں میں پیدا ہوا چند دنوں میں پروان چڑھا۔ چند مہینے ایسے بھی گذر گئے جب بچوں کی سی گالیاں بکتا رہا۔ اب سہولت کے چند سال گذر کر پھر خاتمہ بالخیر ماشاء اللہ ادب کیا ہے ترئی کی بیل ہے جو دیکھتے دیکھتے بڑھی۔ خیال کن زگلستان من بہار مرا۔

ان بزرگوں کا یہ بھی قول ہے کہ ایک ارفع و اعلےٰ ادب ان کے ذہن میں ہے جو ابھی بحالت جنین ہے پیدا نہیں ہوا۔ کوشش میں بیشک لگے ہوئے ہیں جو چیزیں ابھی سامنے آرہی ہیں وہ تجرباتی اقدام کے نتائج ہیں۔ بندہ نواز اگر کوئی شخص اعلیٰ قسم کا عطر کشید کرنا چاہتا ہے تو گلہائے خوش بو عبیر و عنبر جمع کرتا ہے نہ کہ خس و خاشاک و اشیاء متعفن نیز تجرباتی دور میں بھی عطر ہی پیدا کرتا ہے ڈامر نہیں۔ آپ کو دعویٰ ہے ارفع و اعلیٰ ادب پیدا کرنے کا اور تجرباتی نتیجہ میں پیش فرماتے ہیں۔ لحاف۔ بو۔ دھواں۔ سرخ شکوا۔ انتقام۔ عزم خودکشی۔

پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں جس کی ابتدا یہ ہے اس کی انتہا کیا ہوگی۔ یہ چند حوالے تو مشتے از خروارے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ آپ خود کسی وقت عصبیت اور ہٹ دھرمی کی عینک اتار کر اور اپنے ساتھیوں کے کارنامے اٹھا کر دیکھئے اور ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ کیا ان کو ترقی دے کر آپ کوئی ارفع و اعلیٰ چیز پیدا کر سکتے ہیں۔ ایں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است۔ علاوہ بریں اگر جناب کی یہی رائے ہے کہ ابھی تجربے ہو رہے

ہیں تو ازراہِ کرم اس کے نتائج کو منظرِ عام پر نہ لائیں اس لئے کہ وہ سخت مکروہ ہیں جب آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائیں اور وہ ارفع و اعلیٰ نامعلوم شئے جو ابھی جناب کے رحمِ دماغ میں محفوظ ہے اور جسے آپ خود بھی ابھی نہیں جانتے کہ کیا بلا ہے۔ نمودار ہو تو پبلک کے روبرو پیش کریں فی الحال اس بیجان ہستی کے لوکرے کو بند ہی رہنے دیں۔

یہ حال پریشان تو نثر کا تھا جو عرض کیا گیا۔ نظم میں بھی ان حضرات نے کچھ عجیب الخلقت غیر منظم سی چیز پیش کی ہے۔ جسے دیوانے کی بڑ ضرور کہہ سکتے ہیں شعر نہیں۔ ہم چند نمونے پیش کئے دیتے ہیں قارئین کرام خود فیصلہ کریں۔

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
مخملی خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ
لذّتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آمری جان مرے پاس دریچہ کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے۔

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول لے رنگِ جنوں خیز آنکھیں
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک اخلاق کا مارا ہوا ملاسئے حزیں
ایک عفریت ـــــ ـــــ اداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

اس کا چہرہ اُس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

ماشاء اللہ کیا ہندوستان کا نام روشن کرنے والے جیوٹ جیدار سپوت ہیں کہ روز ایک نئی عورت کو زیب آغوش فرماتے ہیں اور پھر جب حاکم قوم کی عورت مل جائے تو اس کے جسم سے خاص طور پر ان کے ہونٹ اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیتے ہیں۔ کیا ہتھیار ہیں اور کیسے سورما ویر۔

یہی بزرگ خیر سے حکومت کے انفرمیشن ڈپارٹمنٹ میں چند سو پر ملازمت بھی فرماتے ہیں شاید یہاں بھی جذبۂ انتقام کارفرما ہو گا۔

ان کے یارِ غار ان حضرت کی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ان کی شاعری

کی بابت فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

جب ارضِ مشرق کی المناک موت کے سانحہ پر غور کرتا ہے۔ تو اس کی روح غم سے لبریز ہو جاتی ہے۔ اس کی روح کا اضطراب شدت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ فرار کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ اس راستہ پر وہ خودی کی کسی موہوم قندیل سے روشنی طلب نہیں کرتا۔ اسے خوب معلوم ہے کہ یہ قندیل اب کبھی روشن نہیں ہونے کی۔ وہ کسی موہوم اور غیر متعین دورِ نو کی جھوٹی خوشی سے بھی اپنے آپ کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ فطرت پرست شاعروں کے مانند وہ قدرت کے نظاروں کو بھی اپنا ذہنی ملجا و ماویٰ بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ انسانی تخلیق کے اس بے پناہ جذبے کو اپناتا ہے جس کی تکمیل جنسی آسودگی سے ہوتی ہے۔ موت قریب ہے وقت کم ہے اور اس گھٹتی ہوئی زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے محبوب کی نرم نرم باہنوں میں گزار دیا جائے۔

تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر لمسِ طویل
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جو اب تک بسر کی ہی نہیں۔

ان کے اپنے قصیدہ خواں کے قول کے بموجب ان کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ مشرق کے لئے اب کوئی امید باقی نہیں یہ شمع ایسی بجھی ہے کہ روشن ہو ہی نہیں سکتی اسی لئے جدوجہد بیکار ہے اب مداوائے کرب صرف یہ ہے کہ یہ مریضِ مایوس باقی ماندہ زندگی آوارہ عورتوں کی آغوش میں گذار دے۔ ایک طرف تو یہ لوگ اپنے جگر شگاف و قیامت خیز مکتوبات سے انقلاب بپا کرنے کے دعویدار ہیں دوسری طرف مایوسی کا شکار اور ہاتھ پیر ڈال دینے کے نہ صرف قائل بلکہ اس

کے مبلغ۔ من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید۔ ان کی کیفیت اس معالج کی سی ہے جو ایک طرف تو مریضِ جاں بلب کو بچانے کا دعویٰ کرے اور موت سے پنجہ کش ہو، دوسری طرف دوا بند کر دے پرہیز اٹھا دے اور مریض سے صاف و صریح الفاظ میں کہہ دے کہ تو بچ تو سکتا نہیں اب دل بھر کر دل کی نکال لے۔ برایں عقل و دانش بباید گریست

اب آپ خود سوچیے کہ یہ ادب اور یہ نظریہ گلشنِ مشرق کو برباد کرنے والا ہے یا شاداب جب قوم کے نونہالوں کے سامنے یہ راہ فرار پیش کی جائے تو ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کارِ طفلاں تمام خواہد شد۔

یہ صنفِ گریز پا مغرورِ زندگی قوم کو جادۂ مرگ دکھا رہے ہیں صرایا حیات نہیں ہم کو وہ نوجوان درکار ہیں جو آخر وقت تک خارزارِ جہاد سے نہ ہٹیں اور بیا آغوشِ گیسو میں دم توڑنے کے قائل ہیں۔

اب ایک اور صاحب کا شعر پڑھتا ہے ذرا ملاحظہ کیجیے فرماتے ہیں۔

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہے
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو
اس پہ

کیوں صرف اچھوتا
انجانا دکھ
اک خواب ہے خلوت؟
کیوں صرف تصور
بہلاتا ہے مجھ کو؟

کیوں صبح شب عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیت
سہلاتا ہے مجھ کو؟
کیوں خواب فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے؟
کیوں گیسوئے پیچیدہ و رقصاں
نمناک نہیں ہے
اشک دل خوں سے؟
کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی؟

اب فرمائیے کیا سمجھے۔ اگر دیوانہ کی بڑ نہیں تو کیا ہے۔ کیا جناب اس گفتار بے ربط کو [illegible] سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ان بے تکی باتوں کا عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ قوم پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہے اس حالت جذب میں جو منہ سے نکل گیا وہ ہی اس دور کا ادب ہے ـــــ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ حالت جذب و جنوں آپ جیسے چند پر کیوں طاری ہوئی دوسرے بھی تو انہی حالات میں لکھ رہے ہیں اور با معنی لکھ رہے ہیں ـــــ مگر یہ بلائے آسمانی آتی ہے کمزور طبع توازن کھو دیتے اور دیوانہ وار بکواس کرنے اور بھاگتے پھرتے ہیں۔ اہل خرد سر جوڑ کر بیٹھتے اور تدارک سوچتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ لوگوں کے دماغ کمزور ہیں آفت کو برداشت نہ کر سکے۔ توازن ہاتھ سے [illegible] بدنصیبی یہ ہے کہ دماغ کی کوئی ایسی چول ہلی کہ دیوانہ اپنی بڑ کو علاج

تصور کرنے لگا اب مفر نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند۔ لیکن یہاں دیوانہ غم جہاں کھانے لگا اب جہان کہاں کا رہا۔

نیز لفظ شعر کا اطلاق کلام موزوں با قافیہ پر ہوتا ہے۔ جناب جس عروف نویسی کو شعر کہہ رہے ہیں وہ اس تعریف میں نہیں آتی۔ ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ زبان کی بقا اس پر مبنی ہے کہ الفاظ اپنے معنی پر قائم رہیں اور رکھے جائیں آج جناب نے لفظ شعر اس کے موضوع کے خلاف استعمال کیا کل کوئی اور جماعت کسی اور لفظ کے معنی بدل دے گی اور اگر یہ مطلق العنانی عام ہوئی تو وہی ہوگا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنا کہا۔ یا آپ سمجھے یا خدا سمجھے۔ —— خیر سے ان بزرگوں کی طبیعت میں جودت تو قیامت کی ہے جہاں ہم نے یہ تعریف پیش کی اور یہ کہہ اٹھے کہ صاحب یہ تو عروضیوں کی تعریف ہے —— بندہ پرور! دنیا میں پہلا عروضی امراء القیس سے تقریباً تین سو سال بعد پیدا ہوا ہے۔ اب جناب ذرا امراء القیس کا خیال اس ادب میں ملاحظہ فرمائیں۔ وہ کہتا ہے ؎

اَذُودُ الْقَوافِی عَنّی زِیادا   زِیادَ غُلَامٍ غَوِیٍّ جرادا

ترجمہ:۔ میں آتے ہوئے قافیوں کو یوں ہٹاتا اور دور کرتا ہوں جیسے کوئی شریر چھوکرا ٹڈیوں کو مار مار کر ہٹاتا ہے۔

جس کے معنی یہ ہوئے کہ امراء القیس شعر کی آمد کو قوافی کی آمد سے تعبیر کر رہا ہے۔ ابن سیرین کا قول ہے۔ اَلشِّعرُ عُقِدَ بِالْقَوافِی۔ شعر وہ کلام ہے جو قوافی کے گرد باندھا گیا ہو۔

دور کیوں جائیے آپ کی اپنی زبان کا یہ محاورہ اس پر استدلال کرتا ہے کہ شعر کے لئے قافیہ لازمی ہے "قافیہ تنگ ہے" "عتاب تخیل پر شکستہ ہے" محاورہ میں نہیں آیا۔ بلبل طبع منقار زیر پر ہے زبان زد خلائق نہ ہوا۔ اس سے یہ

چیز پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس اچھوتی تانتی کے سوا نہ صرف اہلِ سخن بلکہ تمام
خواص و عوام قافیہ کو شعر کا جزو لاینفک سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ
کوئی قول اس وقت تک ضرب المثل نہیں بن سکتا جب تک کہ تمام قوم اسے
تسلیم نہ کرے۔

قافیہ کی عام مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اسے نہ صرف شعر کا جزو لازم مانا گیا
بلکہ آپ کی اکثر ضرب الامثال با قافیہ ہیں کہ۔ نثروں میں یہ حسن کام موجود۔ پہیلیوں
میں یہ نظر آئے۔ نثر تک مقفیٰ اور مسجع لکھی جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام حقائق کے پیشِ نظر جو ہمارے احباب اس
نئی رسم نگارش پر کمربستہ ہیں اور کھلے دل سے بات سمجھنے پر آمادہ نہیں تو آخر
اس کا سبب کیا ہے۔

بندہ نواز ان کا قافیہ تنگ ہے۔ سپ طبع لنگ ہے۔ ذوقِ سلیم دست
زیرِ سنگ ہے نظم کی قیود کے تحت اظہارِ خیالات پر عبور نہیں۔ بحرِ ہنر رہ کر شناوری
دکھا نہیں سکتے اس لئے سات سمندر پار کی بے بہرہ شاعری لائے ہیں اور اس
کو قوم پر نازل کرنا چاہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس گھر میں بفضلہ کپڑے ہوں اس گھر والے باہر معرّا کیوں
جائیں ہاں جن کے ہاں پوشاک کی کمی ہو وہ اپنوں کو منظرِ عام پر عریاں لائیں اردو
کا خزانہ جب قوافی سے بھرا پڑا ہے آج تک کسی مضمون کے باندھنے کے لئے
ہم کو قوافی کی کمی نے عاجز نہ کیا اور یہ سگھڑاپا یعنی اردو اولاد کو محفل میں ہمیشہ نہ
صرف ملبوسات سے آراستہ و پیراستہ لائی گرہ مرصع اور مسجع پیش کرتی رہی پھر آج
ایسی کیا آن بنی ہے کہ اس کے بے پیوست ننگے بچے بزم میں لائے جائیں۔ وہی زبان ہے
اور وہی قوافی جن کی مدد سے سب کچھ کہا رہا ہے اور آج بھی کہتے۔ اسے کہہ رہے ہیں

زبان میں کوئی کمی نہیں جو کمی ہے وہ نادار قسم کے شعراء میں ہے۔

اب ذرا انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کا خیال بھی بلینک ورس کی بابت سن لیجئے ترجمہ پیش ہے قرونِ وسطیٰ کے آخر تک باقافیہ شاعری کا دور تھا۔ جسے کہ بلینک ورس حریف کی حیثیت سے میدان میں آئی۔ بعض اصنافِ سخن کا تو تخیل بھی بغیر قافیہ کے ذہن میں نہیں آسکتا۔

الزبیتھین ادب کے دورِ عروج میں سخت کوشش کی گئی کہ قافیہ کو قطعاً مسترد کر دیا کہ ابتدائی دور کے طرز کی جانب عود کیا جائے۔

اس بدعت کا سب سے بڑا علم بردار کیمبرج کا ایک سنکی گریمرز دہ جبریل ہاردے تھا کہ عرصے کے لئے اس نے اڈمنڈ سپنسر جیسے ترنم بار شاعر کو ورغلا لیا۔ اسی وجہ سے ۵۷۶ء ۔ ۵۷۹ء تک اس کی فن کاری اس بدمذاقی کی وجہ سے تاریکی میں آگئی لیکن اس نے جب شفرڈز کیلنڈر لکھا تو وہ اس بدمذاقی سے مکمل نجات پا چکا تھا۔

ٹومس کیمپین نے ۱۶۰۲ میں غنائی شاعری میں ترک قافیہ کی وکالت کی لیکن اسی دور کے بہترین نقادوں مثلاً ڈینیل نے اسے رد کیا۔

یہ ہیں خیالات اس حسینہ کی بابت اس ملک والوں کے جہاں اس نے جنم لیا اور یہ نافہم غیر سے اس بدعت مکروہ کو گلے کا ہار بنائے پھرتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ قوم کے لئے طوقِ لعنت ہیں اور انہیں اتار پھینکنا اولیٰ۔
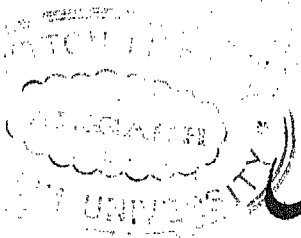
نیا ادب میری نظر میں

رشید احمد صدیقی

جدید اور قدیم کی آویزش اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ زندگی۔ اس سے نہ ڈرنا چاہئے اور نہ ڈرانا۔ ادب سنت اللہ نہیں کہ اس میں تبدیلی ناممکن ہو۔ شعر و ادب انسانوں کی بنائی ہوئی چیز ہے اور انسانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اسے ڈھالتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی فراموش کرنا چاہئے کہ شعر و ادب، اعلیٰ انسانوں کی اعلیٰ اور متحدہ سرگرمیوں کا نتیجہ ہے اس کو ادنےٰ یا مشتبہ مقاصد کے لئے زیر و زبر نہ کرنا چاہئے۔ یہ سوسائٹی کے ساتھ غداری ہوگی جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اگر کوئی شعر و ادب قوم و جماعت کی نظر و فکر کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا تو اس شعر و ادب کو جوں کا توں رہنے دینا کبھی کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے!

ترقی پسند ادب سے ایک خاص قسم کا ادب مراد ہے یعنی وہ ادب جو گزشتہ کم و بیش چوتھائی صدی کی گوناگوں مقتضیات تحقیقات اور تجربوں کے کسر و انکسار سے بروئے کار آیا۔ اس کے علمبرداروں کا شاید یہ خیال ہے کہ اردو میں ترقی پسند ادب کے علاوہ جو ادب ہے وہ ترقی پسند یا ترقی پذیر نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اردو شعر و ادب نے نہ صرف ہماری زندگی کی عکاسی کی ہے بلکہ اس کو مختلف راستوں پر بھی لگایا ہے۔ ممکن ہے کل کے یہ راستے آج کی منزل کی طرف رہبری

نہ کرتے ہوں لیکن ہماری زندگی نے ادب کا اور ادب نے زندگی کا ساتھ دیا ہے مجھے تسلیم ہے کہ ہماری زندگی میں جو تغیرات وقتاً فوقتاً راہ پاتے رہے ہیں یا ادب نے ان کی جیسی کچھ ترجمانی کی وہ قابل اعتنا یا قابل اطمینان نہیں۔ البتہ یہ تسلیم نہیں کہ ہمارے ادب اور ہماری زندگی کو ایک دوسرے سے کبھی لگاؤ ہی نہیں رہا۔

آج کل لفظ انقلاب پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ اس لفظ سے ڈرایا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس سے ڈرانے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ انقلاب کو عذاب الٰہی کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ غالباً "الٰہی" سے اتنے ہی ناواقف ہوتے ہیں جتنے کہ عذاب کے مزاد سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص خدا کو جانتا پہچانتا ہی نہ ہو اس کو حق نہیں کہ وہ خدا کے عذاب پر الزام تراشی کرے۔ ہر انقلاب روس کا انقلاب نہیں ہوتا کہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے۔ پھر اگر کوئی چیز درہم برہم ہونے کے لائق ہے تو اس کے درہم برہم ہونے میں مضائقہ کیا ہے۔ دیکھنا صرف یہ چاہیئے کہ زندگی کی وہ اعلےٰ قدریں تو خطرہ میں نہیں ہیں جو حاصل انسانیت ہیں اور جن کو قائم رکھنا اور نافذ کرنا انسانوں کا سب سے بڑا انکشاف اور انسانوں کے لئے سب سے بڑا سرمایہ سعادت ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم پر جو کچھ گزرا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ہم خود اپنے میں یا اپنے شعر و ادب میں پاتے ہیں۔ ہمارا اکثر سخت رہا ہے لیکن ہم کو جان ہر وقت سے زیادہ عزیز رہی ہے۔ ہمارا ہی نہیں شاید سارے مشرقیوں کا شیوہ یہی رہا ہے کہ ہم کڑی سے کڑی مصیبت جھیل جاتے ہیں لیکن معمولی سے معمولی مقابلہ و مقاومت پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہمارے شعر و ادب میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے "آلام روزگار" کو آسان بھی بنائیں گے تو "غم جاناں" سے۔ بایں ہمہ ترقی پسند ادب سے پہلے اردو شعر و ادب کا رخ کسی نہ کسی حد تک بدل چکا تھا اور متفرق و منتشر طور پر اردو کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ علی گڑھ نے

بیک وقت شعر و ادب سے زندگی کو اور زندگی کو شعر و ادب سے متاثر کیا۔ دونوں کو یکجہت کیا۔ دونوں میں بہاؤ اور بہاؤ میں زور۔ زندگی ودیعت کی۔ ادب اور زندگی نے ایک دوسرے کو قوت بخشی اور اس قوت کو ہمارے اچھے لوگوں نے اچھے کاموں پر صرف کیا

اس بنا پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ نئے یا ترقی پسند ادب پر علی گڈھ اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ علی گڑھ نے اردو ادب ہی کو نہیں ہماری قومی اور معاشرتی زندگی کو بڑے وسیع پیمانہ پر بڑی گہرائیوں تک اور بڑی مدت تک متاثر کیا ہے۔ اس لئے اس کو اس کا حق ہی نہیں پہنچتا بلکہ اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ شعر و ادب اور زندگی سے متعلق جو تجربات کئے جا رہے ہوں ان کا مطالعہ کرے ان کو سمجھے اور ہدایت کرنے کی ہمت کرے۔ یہاں ایک امر کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ گو ملک و قوم کا مزاج ان دنوں کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ خالص علمی مسائل کو بھی علمی رنگ میں پیش کرنا اندیشہ سے خالی نہیں لیکن ہر اندیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا لحاظ ضروری کیا جائے۔

علی گڑھ کے اسلامی ادارہ ہونے میں کوئی شک نہیں اور اس کو اسلامی ہونا بھی چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر مسلم ہے کہ یہ یونیورسٹی بھی ہے اور علمی ضروریات و افکار کے اعتبار سے اس کو دوسری یونیورسٹیوں کے دوش بدوش رہنا چاہئے۔ میں کسی اور مذہب کے بارے میں تو رائے نہیں دے سکتا لیکن اسلام کے بارے میں میں نے جو کچھ پڑھا یا دیکھا ہے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ علمی مسائل تو در کنار اسلام مذہبی مسائل پر بھی علمی اور عقلی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کے خلاف نہیں ہے۔ مذہب نے فلسفہ اور منطق کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے۔ نظر بر آں ترقی پسند ادب سے ڈرنے یا بدگمان ہونے کا کوئی محل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنا پرکھنا اور اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنا ضروری ہے۔ علی گڑھ نئی نسل کی سرزمین

ہے جہاں سے نئی تحریکات کا اُٹھنا قرینِ فطرت ہے۔ اس پر علی گڑھ کو فخر کرنا چاہیئے۔

ایسے مواقع پر سب سے بڑی چیز دیکھنے کی یہ ہوتی ہے کہ کہیں ہم زندگی کی آن ابدی قوتوں سے تو نہیں سراسیمہ ہو رہے ہیں جو زندگی کی تشکیلِ نو کے لئے ابتدائے آفرینش سے خود زندگی میں ودیعت ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر تحریکیں غیر طبعی بھی ہوتی ہیں اور ان کا باعث جماعتی یا سیاسی اغراض ہوتے ہیں جو اکثر محدود، غیر مخلصانہ اور ناروا بھی ہوتے ہیں۔ جن کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے انسداد کا فرض بھی علی گڑھ پر عائد ہوتا ہے۔

نئے اور پرانے ادب میں غالباً اتنی مغائرت نہیں ہے جتنی نئے اور پرانے ادب کے علمبرداروں میں مخالفت ہے۔ یہ مخالفت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ فریقین کی نظر ایک دوسرے کی خوبی پر بھولے سے نہیں پڑتی اور ایک دوسرے کی کمزوری پر بار بار پڑتی ہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو نجات کا دروازہ دونوں پر بند ہو جاتا ہے اور غالباً اس شخص پر بھی جو ان دونوں کے درمیان میں پڑے!

نئے ادب کی تحریک بے جان نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ نئے ادیبوں کے نیت پر اعتماد نہ کیا جائے اور ان کے اسالیب اور موضوع کو پسند نہ کیا جائے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ سمجھدار مخلص اور صاحبِ فن ہیں ان کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے محض ماتم یا مخالفت کرنے سے نہ کام بنتا ہے اور نہ نام روشن ہوتا ہے۔ فن نمو پذیر ہے اور ترقی پذیر بھی اس لئے کہ فن کی بنا قوانینِ فطرت پر نہیں بلکہ انسانی کارکردگی پر ہے جو ترقی پذیر نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہے۔

گزشتہ پچاس سال میں ہندوستان میں نسبتاً کم اور اس سے باہر بہت زیادہ اور بڑے شدید انقلابات ہوئے ہیں۔ جو لوگ دنیا کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ پہلے زمانے میں انسانوں کے خروج اور یلغار سے دنیا کے کاروبار اور زندگی کے رُخ اور روانی میں انقلابِ عظیم برپا ہوتا تھا۔ اب اس کی نوعیت

بدل گئی ہے اب سائنس اور فلسفہ کی تحقیقات اور تجربے انسانوں کے بطون کو زیر و
زبر کرتے ہیں اور تصورات و افکار کے انقلاب سے زندگی کی رَو اور روانی میں تغیرات
برپا ہوتے ہیں۔ یہ تغیرات بڑے دیرپا اور اہم ہوتے ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونا
بڑا مشکل کام ہے اس لئے کہ یہ زندگی کی قدریں بدل دیتے ہیں اور ظاہر ہے جب
زندگی کی قدریں بدلنی والی ہوں اس وقت کیا کچھ نہ پیش آتا ہوگا۔

شعر و ادب میں ہم اسی بدلی ہوئی زندگی کے تار و پود دیکھکر برہم اور بدحواس
ہو رہے ہیں۔ ایسے ہی مواقع پہ برہمی اور بدحواسی سب سے زیادہ بے محل ہوتی ہے۔
ممکن ہے یہ نتیجہ ہو اس کا کہ ہمارے پاس پیش کرنے کی کوئی چیز نہیں ہے یا ہم کو اپنی
متاع پر اتنا بھروسہ نہیں ہے کہ ہم اُسے بازار میں لانے کی ہمت کریں۔ حالانکہ ہمارے
پاس زندگی کے جو بیش بہا خزانے ہیں وہ اسی دن کے لئے ہیں کہ ان کو بازار میں لاکر
کرنسی اور صرافہ کے تہلکہ و تلاطم کو اعتدال پر لایا جائے۔

ہندوستان میں مسلمان سلاطین کا دورِ حکومت خالص اسلامی نہیں رہا ہے۔
اور یہ بات آج کی دریافت کی ہوئی نہیں ہے بلکہ خود ان سلاطین کے دورِ حکومت
میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا تھا اور اس کا ردِّ عمل بھی ہوا۔ خالص اسلامی حکومت
قائم ہو سکتی تھی یا نہیں اور باستثناء چند، مسلمان سلاطین میں اس کی صلاحیت یا
اس کا ولولہ تھا یا نہیں اس کا یہاں سوال نہیں۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ حکمران
مسلمان تھے اور رعایا بیشتر ہندو۔ ان حکمرانوں کی پالیسی بالعموم اشاعتِ اسلام
نہیں بلکہ امن عام تھی جس میں وہ اس درجہ کامیاب ہوئے کہ ہندوستان میں ایک
نیا تمدن وجود میں آگیا۔ اور یہ وہ تمدن تھا جس پر ہندو یا مسلمان فخر نہ بھی کریں تو
ان کو نادم ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مغلوں کی سلطنت ختم ہوئی اور انگریزوں
نے ان کی جگہ لی۔ علومِ جدیدہ عام ہوئے۔ ہندوستانیوں کی نظریں غالباً ہندوستان

کی تاریخ میں سب سے پہلے ہندوستان کے باہر بھی پہنچیں۔ تعلیم، سیاست، تمدن اور مذہب و اخلاق وغیرہ کے نئے اور بدلیسی نظریے سامنے آئے۔ بیسوی صدی کے ابتدائی دور تک ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی تمامتر کوشش یہی ہوتی رہی کہ چھوٹی یا بڑی نوکریاں ملتی رہیں، مذہب و اخلاق کو ثانوی حیثیت دی گئی، یہاں تک کہ بعض بڑے لوگوں نے مذہب و اخلاق کی اہمیت اور احترام کو اسی حد تک مانا اور منوایا جس حد تک یورپ اس کو مانتا یا منواتا تھا۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کے لئے عجیب عجیب پیچیدگیاں پیدا کردیں۔ ایک طرف مسلمانوں میں علوم جدیدہ کی کمی، دوسری طرف اسباب معیشت کا فقدان، تیسری طرف حکومت میں دخل پانے سے محروم یا معذور، چوتھی طرف ہندوؤں سے مقابلہ جو حکمران نہ تھے لیکن حکمرانی کے سارے ذرائع اور وسائل پر قابض تھے۔ اور ان سب پر فوق اپنے مذہب و اخلاق سے بے بہری یا بے خبری قوموں میں طاقت پیدا ہوتی ہے یا تو مادی ذرائع اور وسائل سے یا پھر قوت ایمانی سے مسلمان ان دونوں امور میں کمزور تھے۔ ایسی حالت میں دو خطرات کا سامنا ہوتا ہے یا تو اغیار کا غلبہ ہوتا ہے یا قوم کی قیادت دوسرے اور تیسرے درجے کے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

غالباً یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ یورپ میں ترکی حکومت کو پے بہ پے مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ جنگ بلقان اور جنگ طرابلس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔ اور ترکوں کی حمایت میں ہندوستان کے مسلمانوں نے جس ہمدردی، سرگرمی اور سرفروشی کا ثبوت دیا وہ محتاج بیان نہیں۔ اس جذبہ کو مہمیز کرنے میں علامہ شبلی مرحوم، مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں جن میں باستثنا ء مولانا

ابوالکلام اور ڈاکٹر انصاری مرحوم سب کے سب علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے جو نمایاں حصّہ لیا اس کا تفصیلی تذکرہ ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ اس تحریک نے علی گڑھ تحریک کی افادیت اور معنویت کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا اور اس میں نئے اور دوررس امکانات پیدا کر دیئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی ترکی پر تباہی آئی، خلافت کا خاتمہ ہوا۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں جس سانحہ نے سب سے شدید ابتری پھیلائی وہ عزل خلافت تھا۔ ایک طرف تو ان کو ترکوں سے جو والہانہ عقیدت تھی وہ بُری طرح مجروح ہوئی دوسری طرف خلافت تحریک کے سلسلہ میں جو سرمایہ اکٹھا ہوا تھا جس میں ایک خطیر رقم کے علاوہ ہر طبقہ کے مسلمانوں کے ایثار اور سرگرمی کی بیش بہا دولت بھی جمع تھی اس کا انجام بھی اچھا نہ ہوا۔ اسی دوران میں مانٹگو چیلمسفورڈ اصلاحات نافذ ہوئیں، صوبوں میں آئینی آزادی ملی، اور نہرو رپورٹ پر مسلمانوں کو ہندوؤں سے بدظن ہونے کا موقع ملا۔ یہ وقت بڑا نازک اور اہم تھا اور مسلمانوں کے لئے مرکزی اور مستند قیادت کی بڑی ضرورت تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قیادت متفرق اور منتشر ہو گئی۔ علی گڑھ کا سردار اب قوم کا سالار نہ تھا۔ مذہب کے رہنما، سیاست کے رہنما، تعلیم کے رہنما ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ ٹولی بنا لی۔ قوم پس پشت ڈال دی گئی مذہب کے رہنما نے سیاست کی گدی تاکی سیاست کے رہنما نے مذہب پر چھاپا مارا۔ تعلیم کا رہنما بھی کسی سے پیچھے نہ رہا۔ جب چاہا مذہب کے مصلّے پر جا بیٹھا اور جب موقع ملا سیاست کے ایوان میں داخل ہو گیا۔ ملک سے لیکر میونسپلٹیوں تک ہر طرح کے لیڈر ہر طرف پھیل گئے۔

یہ جنگ مدتوں جاری رہی اس درمیان میں کسی نے یہ نہ دیکھا کہ جن بیچاروں کی پونجی پر یہ رہنما بازی لگاتے رہتے ہیں ان کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ ان کا حشر وہی

ہوا جس کا آج ماتم ہے۔ نوجوانوں کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ نہ ان کی رہبری کی گئی نہ ان کے لئے تکلیف اٹھائی گئی۔ اُن سے فائدہ اٹھایا گیا ان کو فائدہ نہیں پہنچایا گیا چنانچہ ان نوجوانوں نے وہی کیا جو کسانوں اور مزدوروں نے روس میں کیا۔ انہوں نے "بڑوں اور بزرگوں" کو نظر انداز کر دیا اور ان سے بیزار ہو گئے اور یہ بیزاری اتنی بڑھی کہ بڑوں اور بزرگوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے "بڑائی اور بزرگی" کو بھی قابلِ التفات نہ سمجھا۔ نوجوانوں کا جنون نیا تھا انہوں نے نیا ویرانہ تلاش کیا اور ہمارے لئے یہ پیام چھوڑا ؎

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غُبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

خلافت تحریک کے حسرتناک انجام کے ساتھ ترک موالات کی تحریک بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ترک موالات کی تحریک نے نوجوانوں کے دبے ہوئے ولولوں کو ابھارا۔ اس طوفان میں نہ چھوٹے چھوٹے رہ گئے نہ بڑے بڑے اور وہی ہوا جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ پرانے لوگوں کی سیادت ختم ہو گئی جس کے ساتھ پرانے نظریئے، پرانے قرینے، پرانی تقدیریں بھی نہلکہ میں پڑ گئیں۔ سیلاب کا کوئی راستہ مقرر نہیں ہوتا اور نہ سیلاب کو اس کی پرواہ کہ اس کی زد کہاں اور کس پر ہے۔ یہ تو ملک کے اندرونی دھارے اور بھنور تھے۔ ان میں مزید تیزی اور تلاطم باہر سے بھی آیا جن کا مختصر اور محض سرسری جائزہ لینا بے موقع نہ ہوگا۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد یورپ کی جو حالت ہوئی وہ بجائے خود ایسی تفصیل چاہتا ہے جس کے لئے ایک دفتر بھی کافی نہ ہوگا۔ اس کا کچھ اندازہ ان تصانیف سے ہوتا ہے جو یورپ کے سربرآوردہ ارباب نظر و فکر نے شائع کیں ہر شے کو نیست و نابود کر دینے میں ان بے کراں ذرائع اور وسائل سے کام لیا گیا جو صدیوں

کے محیر العقول تجربات اور انکشافات سے بروئے کار آئے تھے اور جسے انسانی ترقی کا
معراج کمال سمجھا جاتا تھا۔ یورپ میں قیامت برپا ہوگئی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا نظام
شمسی کے آباد سیارے کشش ثقل سے آزاد ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش
پاش ہو رہے ہیں چشم زدن میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ دولت، عزت، فراغت، انسانیت
مذہب و اخلاق، سب کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس صورت حال نے کر دیکھتے دیکھتے
کچھ سے کچھ ہو جائیگا اور ممکن ہے زندگی کی امروز پر فردا ختم ہو چکا ہو۔ لوگوں کے
دلوں میں یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ تھوڑی بہت جو مہلت ملی ہے اس کو پوری بے باکی
اور آزادی سے کام میں لایا جائے۔ پس انداز کرنے، آگے کی سوچنے، اخلاق و آداب
برتنے یا اس کی توقع رکھنے، کسی کا ڈر، کسی سے امید، نیک کام کرتے، اچھا نام چھوڑنے
غرض کسی سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ بقول بابر ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یورپ کی بیشتر جنگ زدہ اقوام نے بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت زندگی
اور انسانیت کی ہر قدر و قیمت کو لوٹا اور لٹایا۔ جس جنگ کا یہ حال رہا ہو اس کی صلح
کیسی کچھ سنگین نہ رہی ہوگی۔ یورپ کی سرزمین پر جو بساط نو بچھائی گئی اس کا رنگ و
نقشہ بازی اور بازیگر سب بدلے ہوئے تھے۔ بیشتر یورپ ایک مہیب تہلکہ میں
سب کچھ کھو کر اور کچھ نہ پا کر زندگی کی قدیم فضا اور بندھے ٹکے راستوں پر از سر نو کھڑا
نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے زندگی کے نئے اوراق نہ پلٹے اور نہ ان کی نئے
سرے سے شیرازہ بندی کی۔ اس نے تصنیف ہی بدل دی۔ چنانچہ روس، جرمنی
اور اٹلی وغیرہ میں جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

یہاں اس نکتہ کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ انسانی ذہن و فکر کی سب سے
بڑی عظمت یا لعنت یہ ہے کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے خواہ فرد کے اعتبار سے خواہ

جماعت کی حیثیت سے اس کے لئے سند جواز ڈھونڈ ہی لیتا ہے وہ بھی ایسی سند جواز کہ۔ ع

"ملک گفت احسن فلک گفت زہ"

یہاں تک کہ عوام تو عوام خواص بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ بتایا جا رہا ہے وہ اس صدی کا سب سے بڑا انکشاف ہے جس کو الہام سے کم درجہ نہ دینا چاہئے حالانکہ بیشتر اس کی محرک ہوتی ہے شخصی یا جماعتی خود غرضی اور سفلی جذبات سے قطع نظر بعض موٹی موٹی باتوں پر غور کیجئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں ابتدا سے آخر تک جوں کی توں رہنے دی گئیں اور ان پر نظر ثانی نہیں کی گئی۔ ضرور کی گئی۔ لیکن یہ بھی یقین ہے کہ یہ شروع اسی طور پر ہوئی تھی۔ مثلاً جرمن قوم دنیا میں امام الاقوام کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے وہ جو کچھ کرے حق بجانب ہے۔ روس میں جو کچھ ہوا وہ تمام دنیا کے لئے باعث تقلید ہے۔ مذہب کا کوئی دخل زندگی میں نہ ہونا چاہئے حکومت مزدور طبقہ کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ عورت کی وہ حرمت بے معنی ہے جو مذہب و اخلاق نے بتائی ہے۔ تہذیب وہ ہے جو حکومت بنائے یا منوائے نہ وہ جسے برگزیدہ اور بھلے مانس انسان بنائیں اور پھیلائیں اور تہذیب پھیلانے میں جو ذرائع اور وسائل اختیار کئے جائیں وہ حق بجانب ہیں۔ خام اجناس یا اشیا کے ممالک صنعتی ممالک کے مقابلہ میں غیر مہذب ہیں۔ "فائدہ حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو"۔ ہر انسانی فعل کے محرک اعظم جنسی میلانات ہیں اس لئے ان میلانات کا مظاہرہ ہر موقع و محل پر جائز ہی نہیں ضروری بھی ہے۔ شعر و ادب کو زندگی کی عکاسی کرنی چاہئے اور زندگی وہی ہے جس میں جنسی میلانات یا نفسانی خواہشات کی تسکین کے سامان ہر شخص کو فرداً فرداً اور فی الفور ملتے ہوں۔ تعلیم و معاشرت کے قوانین کے ردوبدل میں افراد کے میلانات کو قطعاً دخل نہیں لیکن مذہبی

اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جانے کا ہر کس و ناکس کو اختیار ہے۔ ہر مقام اور ہر موقع پر خیرہ سری اور مطلق العنانی جائز ہے اس لئے کہ ہٹلر اور مسولینی کی خیرہ سری اور مطلق العنانی کا لوہا دنیا مانتی ہے اس کے ساتھ ساتھ نفس انسانی کی اس کمزوری کو بھی مدنظر رکھئے کہ وہ کامیاب اشخاص یا اقوام کی اُس قربانی اور ریاضت کی طرف متوجہ نہیں ہوتی جو اس کے عروج یا شہرت کا باعث ہوئیں بلکہ اس بدوضعی کو سب کچھ سمجھ لیتی ہے جو بالعموم شاندار کامیابی کے لوازم میں سے ہے۔ کمزور اور نامعقول طبائع کے لئے کامیاب اشخاص یا تحریک کا وہی پہلو سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے جو کمزور اور نامعقول ہوتا ہے۔

جدید ادب میں جن امور پر اکثر زور دیا جاتا ہے وہ وہی ہیں جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، عورت، سرمایہ و مزدور، انقلاب، زندگی کی دیرینہ قدروں کو زندگی کی موجودہ مصیبتوں کا ذمہ دار قرار دینا، اپنے سے مایوسی دوسروں سے بیزاری نفس کی حیوانی خواہشوں کو اصل حیات سمجھنا اور ان کو تسکین دینے میں انتہائی بیباکی سے کام لینا، "احترام" اور "حفظ مراتب" کو زندگی کے لغت سے خارج کر دینا جدید ادب کے بڑے اہم اور مقبول مضامین ہیں۔ مانا کہ صورت حال یہی ہے لیکن اچھے اور بڑے لوگ صرف اتنا دیکھ لینے پر اکتفا نہیں کر لیتے کہ زندگی کن پستیوں میں جا گری ہے اور نہ ان پستیوں سے کھیلنا یا اپنی پوری استعداد کو اس کھیل پر صرف کر دینا کوئی فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ وہ زندگی کی آلائشوں کو دور کرتے ہیں اور اسے اُن بلندیوں پہ فائز کرتے ہیں جس کی زندگی مستحق ہے اور جس کا امکان خود زندگی میں ودیعت ہے اور یہ وہ سعادت اور عظمت ہے جو اچھے اور بڑے ہی لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔

جدید ادب اپنے مخصوص انداز اور مخصوص مصطلحات میں ہم کو یہ بتاتا ہے کہ ہم محکوم، مظلوم اور مقہور ہیں، سلاطین، سرمایہ دار اور دیگر مذہبی پیشواؤں نے

غریبوں کو روند ڈالا۔ اور سوسائٹی میں جو خرابیاں نظر آتی ہیں ان کا سبب سلاطین، سرمایہ دار اور مذہبی پیشواؤں کی چیرہ دستی ہے۔ ان سے نجات پانا اور آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہوتا ہے کہ خدا، خدا کا تصور، خدا کے احکام اور خدا کے نام لیوا سب بے معنی! یا ہر مایوسی اور بیزاری کی تسکین جنسی اشتہا کی تسکین سے ہو سکتی ہے یا ہونی چاہیئے یا شعر و ادب میں جبتک فسق و فواحش کو دخل نہ دیا جائے زندگی کی عکاسی نہیں ہوتی یا جب تک قتل اور غارت گری عام نہ ہوگی افلاس سے نجات نہ ہوگی۔ یا روس کا مسلک اسی وقت اختیار کیا جا سکتا ہے جب ہم سارے مسلکوں پر لعنت بھیجدیں۔

یورپ کی تجارت کے اس راز کو غالباً اب سب سمجھنے لگے ہیں کہ جو چیز بیچنا چاہتے ہو اُس کے لئے ضرورت یا مانگ پیدا کرو۔ مثلاً چائے فروخت کرنی ہے تو چائے کے فوائد ذہن نشین کراؤ۔ اور چائے پیدا کرنے یا چائے پینے والوں کے ساتھ مراعات کرو۔ چنانچہ ہم نے فسق و فواحش کو جائز قرار دینے کے لئے سب سے پہلے زندگی کے اُن فضائل کو رسوا کرنا شروع کیا جو انسانی بداعمالیوں کے سدِ راہ ہوتے ہیں اس کے بعد یہ تحقیقات پیش کرتے ہیں اور بہت ممکن ہے یہ تحقیقات صحیح بھی ہو کہ ہر انسانی فعل کا محرک اعظم جنسی جذبہ ہے خواہ وہ فعل لیڈر کا ہو خواہ بچے کا۔ اس سے یہ لازم آیا کہ جنسی جذبہ کی تسکین یا اُس کا مظاہرہ بہرحال روا ہے اور جب یہ چیز ہماری سرشت میں داخل ہے تو سوسائٹی میں بھی اس کی رعایت رکھنی چاہیئے۔ یہ نہ ہو تو کم سے کم اس طرف سے چشم پوشی کرنی چاہیئے۔ اس مثال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ چونکہ انسان کبھی بندر تھا اس لئے بندروں کی سی حرکت کرنا آرٹ یا فطرت میں داخل ہے۔ چونکہ آرٹ یا ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے زندگی کی گندگیوں کو اچھالنا اور نفسانی خواہشات کی تسکین یا تمجید پر فخر کرنا آرٹ د

ادب کی بڑی خدمت ہوئی۔ جاڑے میں نمونیہ بھی ہوتا ہے اس لئے نمونیہ حاصل نمستان ہے اور نمونیہ کے لئے جاڑے کو دعوت دینا چاہئیے۔ یا جاڑا آئے تو نمونیہ طاری کر لینا جاڑے اور نمونیہ دونوں کی عزت افزائی کا موجب ہوگا۔

میرے ایک دوست ہیں جن پر مذہب کا رنگ زیادہ غالب ہے لیکن یہ رنگ ہے کچا، دیکھنے میں نہایت دیدہ زیب لیکن دھوپ یا پانی کا چھینٹا پڑ جائے تو نقشہ بدل جائے۔ ان کا میں مہمان ہوا۔ اللہ اکبر! ہر طرف دائیں بائیں اوپر نیچے مذہب، اخلاق، طب، تصوف، اور تعزیراتِ ہند کے قتادے آویزاں۔ کم کھاؤ یا بالکل نہ کھاؤ، سوؤ مت، گپ نہ کرو۔ زور سے نہ بولو، قہقہہ نہ لگاؤ، اکڑوں بیٹھو، بائیں پاؤں پر زور دو۔ نگاہ نیچے رکھو۔ مرنے کے لئے تیار رہو، عذاب الیم سے ڈرو، قیامت کو نہ بھولو، شیطان سے بچو، چوری نہ کرو۔ میں بدحواس ہوگیا۔ عرض کی یہ حضور والا جان کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کروں فرمایا ہاں ہاں ارشاد ہو، میں نے کہا کہ آپ نے جو کچھ لکھ کر آویزاں کر رکھا ہے وہ سب برحق اور ایسا ہی ہونا چاہئیے لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر وقت مہمان کی تادیب وتنبیہ ہی ہوتی رہے۔ کوئی وقت تو ایسا ملنا چاہئیے جب میں موت کا مہمان ہونے کے بجائے اپنے آپ کو کسی شریف آدمی کا مہمان بھی محسوس کر سکوں۔ کھانا مجھ پر بند، نیند مجھ پر حرام، زبان ہلانا میرے لئے ممنوع، چوری کرنے سے میں محروم، تھوڑی دیر میں آپ مجھ سے سوال کریں گے تیرا رب کون؟ تو میں کیا جواب دوں گا۔ خدا کے لئے یہ کتبے اتروائیے یا مجھے رخصت کیجئے اور صدر دروازے پر میری طرف سے یہ کتبہ بھی لگوا دیجئے کہ اس گھر میں تجہیز و تکفین کا بندوبست مفت کیا جاتا ہے!

ہر بڑے واقعہ یا بڑی شخصیت کے لوازم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے نااہل اور نامعقول پیرو کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص غلام ممالک میں جہاں کے لوگ عموماً نکمّے ہوتے ہیں۔ یورپ میں نازیت فسطائیت یا اشتراکیت

کو فروغ ہوا تو ہم ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں نے ہر طرح کی شرافت اور سلیقہ کو خیرباد کہہ کے ان کی پیروی شروع کردی۔ ہٹلر، مسولینی یا اسٹالن نے اپنے شخصی جبروت یا اپنے مخصوص نظام کے ماتحت جو کچھ کیا یا کر دکھایا وہ ہمارے لئے سند بن گیا، ہم نے یہ مطلق نہ دیکھا کہ ان سب کو عروج پانے سے پہلے کن منازل سے گزرنا پڑا۔ انہوں نے کیسی سختیاں جھیلیں اور کن آزمائشوں سے گذرے اور اب بھی یہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ اپنی جان کی بازی لگا کر کر رہے ہیں۔ ہم نے ان کے انداز تو اختیار کر لئے ان کی ریاضتوں کو فراموش کر دیا۔

آرٹ ہو، ادب ہو، آزادی ہو، ان کے اصول ہی نہیں مقرر ہیں ان کی ریاضتیں بھی متعین ہیں۔ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس طرح ملیریا کے جراثیم دریافت کرنیوالے ڈاکٹر نے ہر طرح کی سختی جھیل کر ہمارے لئے ملیریا کا علاج دریافت کر دیا اور اب ہم بغیر کسی خرخشے کے کونین کھا کر یا اس کا ٹیکہ لگا کر ملیریا سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح ہم روس کی سختیاں جھیلے بغیر روس کا مسلک اختیار کر لیں گے تو روس کے درجہ پر فائز ہو جائیں گے۔ یہ غلط ہے۔ روس کے مصنفین کا درجہ روسی مصنفین کی تصانیف کا چربہ اتارنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ٹالسٹائی، گورکی، چیخوف، ترگنیف اور دوسرے لوگ جس بلندی پر نظر آتے ہیں اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کسی آرٹ یا ادب کی فی نفسہ پیروی کی ہے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو زندگی کی چکی میں پیسا ہے اور ریاضت کی بھٹی میں پگھلایا ہے تب کہیں جا کر ان کے آرٹ و ادب کو زمان و مکان سے باہر اور بلند ہو جانے کا درجہ نصیب ہوا۔ ایک حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے سے ممکن ہے ان کے تمام پیروؤں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ اس بنا پر ممکن ہے نئے ادب کے پیرو بھی اپنے آپ کو ناجی قرار دیتے ہوں لیکن آرٹ اور ادب میں نجات اسی کے لئے ہے جو خود مصلوب

ہے جس طرح۔ ع

"سر محبت کربلائے ہست باید شد شہید اینجا"

اسی طرح آرٹ و ادب بھی کربلا ہیں جہاں شہادت نہیں تو کچھ نہیں!

ہمارے نوجوانوں نے اقبال کے پردہ میں بھی خوب خوب گل کھلائے ہیں۔ معلوم نہیں اقبال نے کس عالم میں پہنچ کر کہہ دیا کہ خودی کو اتنا بلند کر کہ خدا اپنے بندہ سے خود پوچھے کہ تیری رضا کیا ہے۔ پھر کیا تھا ہر ایک مغز اس خیال میں مست نظر آنے لگا کہ اللہ تعالےٰ نے اس سے مشورہ کرنا شروع کر دیا ہے اور ظاہر ہے جب اللہ تعالےٰ کے مشیر خاص بن گئے تو باہمی تعلقات میں بھی ترمیم لازم آئی یعنی خود اللہ کی حیثیت "فاضل دوست" یا "رفیق کار" کی رہ گئی اس لئے بے تکلفی میں اگر کبھی غیر رسمی کلمات دوست کے لئے منہ سے نکل گئے تو ہرج ہی کیا ہے اور اسی بے تکلفی میں بندوں کی جان لے لی یا ان کی آبرو اتار لی تو کیا مضائقہ۔ یا اقبال نے ایک خاص زاویہ نگاہ سے شیطان کے درجہ کو جس طرح پیش یا بلند کیا ہے اس کے بعد خدا سے بے باک ہونے میں نہ صرف یہ کہ کوئی ہرج نہیں بلکہ اس سے آرٹ میں بلندی، فکر میں گہرائی، اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے!

یہی حالت ہماری زندگی کے ہر نشیب و فراز میں آتی ہے۔ ہٹلر اور اسٹالن چونکہ کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں کرتے اور مخالفین کو تہ تیغ کر دیتے ہیں اس لئے ہم کو بھی کسی کے کہنے سننے کی تاب نہیں۔ ہم تہ تیغ بھی کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ حکومت ہم کو تہ تیغ نہ کر دے لیکن چونکہ اس کا موقع نہیں اس لئے ہر کھلے ناقص کو فضیحت کر دینے کا حق حاصل ہے۔ ہم مامورین اللہ ہیں اس لئے دوسرے مغضوب من اللہ ہیں۔ یورپ کا فلاں مشہور مصنف اپنی کمزوریوں یا گناہوں کو بے جھجک بیان کرتا ہے اور اس کا انشائیہ بہت مقبول ہے اس لئے ہم کو اپنی غلاظتوں کو شعر و ادب

میں ڈھال دینا چاہئے۔ اسی کو آرٹ کہتے ہیں اسی کا نام اسٹائل ہے اور اسی سے
نام روشن ہوتا ہے۔ جگر ایسا کلام نہیں تو کیا پروا جگر جیسا پڑھنا تو آتا ہے! ایسے
شاعر کو جتنا جلد نیا ادیب بنا ڈالا جائے بہتر ہو گا!

اُردو میں نئے ادب کی باضابطہ ابتدا غالباً ۳۲-۱۹۳۳ء میں ممالک متحدہ میں
ہوئی اور اس وقت کے بعض نوجوان لکھنے والوں کے مضامین کا مجموعہ انگارہ کے
نام سے شائع ہوا۔ صوبہ کی حکومت نے اس کی اشاعت ممنوع قرار دی۔ اس کا سبب
یہ نہ تھا کہ انگارہ میں اشتراکی اغراض و مقاصد کی براہ راست تبلیغ کی گئی تھی بلکہ اس
میں ایسے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا گیا تھا اور اسالیب و لہجہ اختیار کیا گیا تھا
جس سے عوام اور خواص دونوں کے اخلاقی و مذہبی تصورات مجروح ہوتے تھے۔
اس وقت سے اب تک ملک میں، ملک سے باہر اور خود نئے ادب میں مختلف
تبدیلیاں راہ پاتی رہیں لیکن جہاں تک نئے ادب کے بنیادی تصورات کا تعلق
ہے کوئی اہم تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔

اس وقت ہندوستان میں جتنی تحریکیں برسرکار ہیں اور جس شد و مد سے
برسرکار ہیں ان سب کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا اور اس کا یہ
موقع بھی نہیں ہے ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ انتشار و خلفشار کا اثر نئے ادب
پر کیا ہے میرا ذاتی خیال ہے اور اس میں شرکت کی کسی کو دعوت بھی نہیں دیتا کہ
جہاں تک مذہب کے احیاء کا تعلق ہے نہ ہندو سرفروشی پر آمادہ ہیں اور نہ مسلمان
اور نہ کوئی اور قوم۔ البتہ مذہب کے نام اور قوم کی حیثیت سے ہندو مسلمان ایک
دوسرے سے سخت بیزار ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں کو مذہب سے وہ شغف نہیں
ہے جو وارفتگی ہندوؤں کو مہاتما گاندھی اور مسلمانوں کو قائد اعظم محمد علی جناح سے ہے۔
چنانچہ نئے ادب میں مذہب سے جو بیزاری ملتی ہے اس کا سبب بھی غالباً

یہی ہے کہ ہندو مسلمان دونوں کے دلوں میں مذہب کی وہ اہمیت اور عظمت نہیں
ہے جو اہمیت و عظمت سیاسی لیڈروں کی ہے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں خالصتاً
سیاسی ادارے ہیں اور سیاسی ہی توازن یا تفوق کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ مذہب
و اخلاق سے براہ راست ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہندوستان ہی نہیں تمام دنیا اس
وقت جس ہل چل میں مبتلا ہے اور لمحہ لمحہ جیسے تغیرات رو نما ہو رہے ہیں ان کو دیکھتے
ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کانگریس اور لیگ ہی نہیں بلکہ ہندو مسلمانوں کو
مذہب کی طرف متوجہ ہونے کی ایک عرصہ تک فرصت نہ ملے گی اور شاید موقع بھی
نہ ملے۔ ایسے مواقع پر ادب میں اخلاق و مذہب اتنے اثر انداز نہیں ہوتے جتنے کہ
سیاسی مصالح چنانچہ موجودہ ادب میں ہم کو اخلاق و مذہب کا احترام نہ ملے
تو تاسف کا محل ہو سکتا ہے تعجب کا نہیں۔

نیا ادب جن حالات و حوادث کے ماتحت وجود میں آیا، جن تیلیوں پر
اس کا ڈھانچہ قائم ہے، جس روپ میں اور جن لوگوں کی معرفت وہ ہم تک
پہنچا وہ تمام تر بدیسی ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ جس چیز کو (خواہ
وہ بھلی ہو یا بری) ایک قوم نے خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا ہو دوسری قوم اسے
من و سلویٰ کے طور پر اپنا سکتی ہے۔ نیا ادب اپنی تمام خوبیوں یا خرابیوں کے
ساتھ یورپ میں ایک معنی رکھتا ہے۔ وہاں ایسے مواقع آئے جب حرام حلال
اور حلال حرام ہو گیا۔ ہندوستان میں نئے ادب کے محرکات اور خود نیا ادب آیا
نہیں بلکہ لایا گیا ہے اور اس کے لانے والے بیشتر وہ لوگ ہیں جو آگ و لہو سے
گزرے نہیں بلکہ آگ و لہو کے تماشہ کی تجارت کرتے ہیں۔ اس میں نئے ادب
کے نثر نگار ہی نہیں شعرا بھی ہیں۔

ادب ہی میں نہیں ہر کاروبار میں دیکھا یہی جاتا ہے کہ کاروبار کرنے والا

کس درجہ کا آدمی ہے۔ لڑائی میں بندوق کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ اس شخص
کی جس کے ہاتھ میں وہ ہو۔ مذہب ادب اور آرٹ وغیرہ میں بھی یہی اصول کارفرما
ہے۔ بنیادی چیز وہ آرٹسٹ کا خون ہوتا ہے جو اس کی مخلوق کی رگ و پے میں دوڑتا
ہے اور اُسے زندہ رکھتا ہے۔ نری آرٹ بازی سے کام نہیں چلتا۔ میں مانتا ہوں
کہ ہندوستان میں وہ خرابیاں موجود ہیں جن کو نیا ادب پیش کرتا ہے لیکن یہ
خرابیاں سنسنی، کراہت یا مایوسی پیدا کرنے والے افسانوں اور نظموں سے دور
نہیں ہوسکتیں۔ تعویذ لکھنا ممکن ہے فعل عبث نہ ہو لیکن یہ کیسے مان لیا جائے
کہ تعویذ لکھنے سے طوفان ٹل سکتا ہے۔

بددلی پھیلانا بھی ایک خدمت ہے لیکن صرف بددلی پھیلانا اور عوام کے
ولولہ کو مہمیز نہ کرنا بڑی بدتوفیقی ہے۔ اس سے قوم کے قوائے عمل مریض اور
مردہ ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح انقلاب کا ہلڑ مچانا بیہودہ فعل ہے اگر انقلاب کی
صف میں کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہو۔ اس طرح کی انقلابی شاعری اور انقلابی
شاعر دونوں میرے نزدیک وہی حیثیت رکھتے ہیں جیسے کوئی غیر ذمہ دار شخص
گلی کوچوں میں لوٹ مار کی خبر اڑا کر روپوش ہوجائے۔ اس طرح کی حرکت کرنے
والے ہر حکومت اور ہر سوسائٹی میں قابل مواخذہ قرار دیئے گئے ہیں۔

نئے ادب کے تار و پود کو مدنظر رکھ کر ان مضامین کا جائزہ لیا جائے جو نیا ادب
پیش کرتا ہے تو پہلی بات یہ نظر آئے گی کہ نوجوان مرد یا عورت کے سامنے زندگی
بحیثیت مجموعی نہیں ہوتی بلکہ اس کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے یعنی جنسی اشتہا کی
تسکین کیونکر ہو۔ بقول غالب کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں۔ ہو تو کیونکر ہو! آخر شعر و
ادب کا مستقل موضوع جنسی جذبہ کی تسکین یا نمائش کیوں ہو۔ اس جذبہ کا میں
قائل ہوں لیکن نہ اس حد تک کہ اس کو زندگی اور زندگی کی اعلیٰ سرگرمیوں کا بجائے

یا تعیش قرار دیا جائے۔ اس جذبہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے سے انسان
کے اعلیٰ فضائل اور اس کی کارکردگی ماند پڑ جاتی ہے۔ نوجوانوں میں جو اس وقت
ایک طرح کی واماندگی اور بیزاری ملتی ہے اس کا سبب بڑی حد تک یہی ہے کہ
انہوں نے جنسی جذبہ کو بہت اہمیت دے رکھی ہے اور جوانی کو صرف جنسی میلانات
و مطالبات کا مترادف سمجھ لیا ہے۔ اسی نشہ میں وہ اپنی ہر طرح کی الجھنوں اور کلفتوں
کو بہلاتے بھلاتے رہتے ہیں۔ اس کا ردِ عمل زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو ان کی نظروں
میں بے نور بنا دیتا ہے۔ وہ زندگی کی ذمہ داریوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنے کے
قابل نہیں رہ جاتے۔ اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احترام کرنے سے معذور ہو جاتے
ہیں۔ جوانی کا نوحہ جس جس طرح اور جس شدت سے اردو شعرا بالعموم اور نئے ادب
کے پیرو بالخصوص کرتے ہیں، اس کی مثال کسی دوسری قوم یا کسی دوسرے شعر و
ادب میں نہ ملے گی۔ جوانی کا یہ تصور اور جوانی کے ساتھ یہ سلوک میرے نزدیک
سفاکی اور بزدلی ہے۔

نئے ادب میں جنسی ترغیبات آخر اس درجہ دخیل کیوں ہو گئی ہیں؟ غالباً اس
کا سبب یہ ہے کہ اس جذبہ کی تسکین میں خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو۔ بڑی لذت ہے
اور یہ لذت آسانی سے سستے داموں مل جاتی ہے۔ اس سے شعر و ادب میں
شہرت پانے کے مواقع جلد اور آسانی سے مل جاتے ہیں ایسی شہرت جس کا مدار
تمام تر گاہک کی کمزوری پر ہے۔ مال کی خوبی پر نہیں۔ اس کی مثال ایک چالاک
باورچی کی سی ہے جو کھانے میں مرچیں تیز کر دیتا ہے اور برف کا پانی مہیا کر دیتا ہے
تاکہ مرچ کی تیزی سے کھانے کے بھلے برے ہونے کی تمیز نہ ہو سکے اور ......
سکے اور مرچ کی تیزی رفع کرنے ....
کی خاطر بار بار پانی زیادہ پیا جائے تو کھانا کم کھایا جائے۔

جس طرح اخبارات میں ہم قتل کی خبر سنتے ہیں تو معاً یہ خیال آتا ہے کہ عورت،
تو بیچ میں نہیں ہے اور اکثر و بیشتر یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح نئے ادب
کا کوئی افسانہ یا نظم آپ پڑھنا شروع کریں تو آپ کو عورت کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی
شکل میں ضرور نظر آجائے گی۔ عورت ہی کے گرد افلاس، انقلاب، دہریت،
بیزاری اور بد توفیقی کی داستانیں پھیلی ہوں گی یا افلاس و انقلاب، وغیرہ میں
عورت پیوست ملے گی۔ ہمارے خود یہ مضامین ایسے ہیں جن میں بیزار، مایوس الحال،
اور کم لکھے پڑھے ادیبوں، شاعروں اور ان سے زیادہ وہ گئے گزرے سامعین
یا قارئین کے لئے بڑی کشش ہے۔

آپ نے گلیوں اور سڑکوں پر عطائیوں کو دوائیں بیچتے دیکھا ہوگا۔ تفریحاً
ان کا خطبہ صدارت بھی ناگفتنی امراض و ناشدنی مجربات پر تھوڑی دیر تک ضرور
سنا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ بزرگ کیا ہیں، کیسے ہیں اور ان کے مجربات کی کیا حیثیت
ہے۔ لیکن وہ جن امراض کے نام سے اپیل کرتے ہیں یا جن طاقتوں کے عود کر آنے
کی بشارت دیتے ہیں اس میں گویا ندا کی آواز جیسی کشش ہے۔ اس لئے کہ بقول
ایک ستم ظریف، ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ انہیں مرضوں کے سب اسیر ہوئے۔

لکھنے والے انہیں باتوں پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ اپنی ناگفتنی کو بھی بڑے
شوق سے اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ اس سے مصنف
خود اپنی تحلیل نفسی پیش کرتا ہے۔ اس تحلیل نفسی کے شوق میں وہ ایسی ایسی
مکروہ باتیں خود اپنے بارے میں لکھ جاتا ہے جس کو سن کر طبیعت مالش کرنے لگتی
ہے۔ یہ بات بھی بڑے لوگوں سے لیکن مسخ ہو کر ان تک پہنچی ہے۔ جس طرح یورپ
کے مطلق العنانوں نے ہمارے چھوٹے بڑوں میں فرعونیت پیدا کردی ہے
اسی طرح بعض بڑے لوگوں نے جو اپنی خود نوشتہ سوانح حیات لکھ دی ہیں ان

کی رَیس میں یہ نوجوان اُن گھناؤنے واقعات کو پیش کرتے ہیں جو کبھی یا اوائل عمر میں اُن کو پیش آئے تھے۔

اس کا اثر ہمارے ادب اور سوسائٹی دونوں پر بہت بُرا پڑ رہا ہے۔ اسے نفسیاتی تحلیل نہیں ماؤف و متعفن ذہنیت کی نمائش کہتے ہیں۔ یہ محض اپنی شخصیت اور انشاپردازی کا پروپگنڈا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی فقیر تضرع اور لجاجت میں اثر نہ پاکر اپنے پوشیدہ سڑے گلے زخموں کی نمایش کرے اور لوگ ترس کھاکر نہیں تو بدحواس و بدخط ہو کر اُسے کچھ دے دلا دیں۔ یہاں بھی یہ عذر پیش کیا جائیگا کہ سوسائٹی میں یہ گھناؤنی باتیں ملتی ہیں اس لئے ان کے جتانے بتانے کی ضرورت ہے۔ مگر کوڑھی اور اس طرح کے لوگوں کے لئے میونسپل قوانین اور میونسپل انتظامات بھی ہیں۔ یعنی یہ آبادی سے دور رکھے جائیں اور گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے نہ دیئے جائیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اس طرح کے مضامین شعر و ادب میں نہیں بلکہ ہسپتالوں کی فائل پر رکھے جائیں۔ جن سے ڈاکٹر کو فائدہ پہنچے۔ ہندوستان کو نقصان نہ پہنچے۔ اعتراف گناہ بالعموم گناہ سے تائب ہونے کے لئے کہا جاتا ہے نہ یہ کہ گناہ کو گناہ کا عذر بنایا جائے۔

فحاشی اور عریاں نگاری میرے نزدیک فن نہیں بدکرداری ہے۔ اس عیب سے قدیم اردو شعراء کا دامن بھی پاک نہیں ہے۔ عربی فارسی کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن گذشتہ اور موجودہ میں ایک فرق بھی ہے۔ پرانے شعرا فحاشی کو فحاشی ہی سمجھتے تھے۔ ادب، زندگی یا آرٹ نہیں سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ جو بات نامعقول ہو وہ اس لئے معقول ہو سکتی ہے کہ اُس کے مرتکب پہلے بھی گذرے ہیں فحاشی کو کبھی نہیں سراہا گیا ہے۔ یورپ میں بعض مشہور مصنف ایسے گذرے ہیں جنہوں نے جنسیات پر مستقل تصانیف شائع کی ہیں۔ بعضوں نے اپنا

نقطۂ نظر طبّی (فنی) رکھا ہے اور بعضوں نے ناول اور افسانے کے پیرائے میں جنسیاتی مسائل پر بحث کی ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے ان لوگوں کا نقطۂ نظر وہ نہیں ہوتا جو ہمارے ادیبوں کا ہے اور نہ وہ ان مسائل کو اُس بیہودگی اور بھونڈے پن سے پیش کرتے ہیں۔ جیسا ہمارے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔

انشاپردازی میں یورپ کے مصنفین یقیناً ہم سے بہت بلند ہیں اُن کے ہاں بڑا سخت مقابلہ ہے۔ دوسرے درجہ کا مصنف وہاں تو ہم عمر نہیں پہنچتا۔ یورپ میں ہر فن کے باکمال سوسائٹی میں موجود ہوتے ہیں، چنانچہ شخص کوئی چیز پبلک میں پیش کرتا ہے وہ پوری تیاری سے پیش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس پر پہنچے ہوؤں کی اکثر جیسی نکتہ چینیاں پڑیں گی۔ دو کوا اور دوڑے کا وہاں گزر نہیں۔ یورپ والوں نے زندگی کے ہر سمت سے تجربے ہیں اور انہوں نے زندگی کا ہر حربے سے مقابلہ کیا ہے۔ اس حملے اور مقابلے ان کی زندگی کا کوئی پہلو خالی نہیں ہے۔ اس سے ان کی نظر میں گہرائی، شعر و ادب میں صلابت اور شائستگی اور فن میں پختگی اور معنویت آگئی ہے۔ انہوں نے زندگی کو کسی واسطے سے دیکھا یا پرکھا نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر سبب سے اُن کا براہ راست سابقہ رہا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ سطحی اور تفریحی امور میں یورپ کی پیروی کرنا اور اس کی ریاضتوں سے منہ موڑنا ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں یہ ہمارے لئے نہایت درجہ خطرناک ہے۔

جو لوگ لکھنے کے ہنر سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی بات کو اول درجہ کا انشاپرداز لکھے گا تو وہ کیا چیز ہوگی اور اسی چیز کو دوسرے اور تیسرے درجہ کے انشاپرداز لکھیں گے تو وہ کیا ہو جائے گی نہ صرف پرداخت کے اعتبار سے بلکہ اثر کے اعتبار سے بھی۔ یورپ کی ہر قسم کی نشاندہی

تھوڑا بہت نقد میری نظر سے گزرا ہے، اردو لٹریچر کا تھوڑا حصہ ایسا ہوگا
جو میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ بحیثیت مجموعی دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دونوں کی
سطح میں ... ہر ملک کے آئین کا دارومدار اس ملک کے باشندوں
کے آئینی احساس یا شعور پر ہوتا ہے۔ مثلاً وحشیوں کو پارلیمنٹری اداروں کی اہمیت
کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہی شعر و ادب کا ہے۔ ایسے لوگوں کو جو اپنے نفس یا قلم
پر قابو نہیں رکھ سکتے یا سوشل ذمہ داریوں کا احساس نہیں رکھتے ... اچھا اور
نہیں تو جنسیات جیسے نازک اور پرخطر مضامین و مسائل پر اظہار خیال کی اجازت
نہیں دی جانی چاہیئے۔ ورنہ دین یا جرائیم کو نہیں لوگوں کی نگرانی میں دینا چاہیئے جو ان
پر اور اپنے آپ دونوں پر قابو پانے یا رکھنے کے اہل ہوں۔

ہندوستانی سینما اور تھیٹر کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ادب
اور معاشرت کی ترقی میں یوں مفید نہیں ہیں کہ یہ کمپنیاں خدمت نہیں کرنا چاہتیں
روپیہ کمانا چاہتی ہیں۔ عوام کی سیرت اور ذوق کو سدھارنے سنوارنے سے
ان کو کوئی سروکار نہیں۔ جو مصنف ان کمپنیوں کے لئے کوئی چیز تصنیف کرتے
ہیں وہ عوام کی سطح پر اُترنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں اور چار و ناچار وہی کرتے ہیں
جو سینما اور تھیٹر کے منیجر چاہتے ہیں۔ بے تکے قصے، مہمل زبان، چٹپٹے اشعار،
مسخرا پن و مسخرگی، بوس و کنار، دھول دھپا، توڑ پھوڑ، گالی گلوچ۔ غرض اسی قسم
کی خرافات، کہیں کم کہیں زیادہ۔ اکثر نئے شاعر اور ادیب بھی اسی پر اتر آتے
ہیں اس لئے کہ اس میں نفع ہے۔ چونکہ عوام اسی قسم کی چیزوں سے خوش ہوتے
ہیں اس لئے ان سے اسی طور پر نفع کمایا جا سکتا ہے۔ عوام سستی اور کافی
مسکرات چاہتے ہیں، ادیب سستی اور کافی شہرت چاہتا ہے۔

کوئی حرف گیری کرے تو کہتے ہیں ہم جمہور کے آدمی ہیں جمہور کے لئے ہیں اور جمہور ہی کی تفریح یا تعلیم کا سامان بہم پہنچاتے ہیں "بورژوا" سے یہی نہیں کہ ہم کو کوئی سروکار نہیں بلکہ ہم اس کا قلع قمع کر دینا سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔ اگر اصلاح عوام اسی کو کہتے ہیں تو پھر بڑے بڑے صنعتی شہروں میں کیا برائی ہے جہاں کارخانوں ہی سے قریب شرابخانے اور قحبہ خانے ہوتے ہیں جہاں شام کو تھکے ہارے مزدور دن بھر کی مزدوری شاہد و شراب کی نذر کر دیتے ہیں اور دنیا مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ان معصوم یا مریض ادیبوں کو کون بتائے کہ عوام آپ کی نفسیاتی تحلیل کو نہیں سمجھ سکتے وہ نفسانی ترغیب کی زد میں ہوتی ہیں۔ مزدور اور اہل حرفہ کو نہ اتنی فرصت ہوتی ہے اور نہ اتنی استعداد کہ وہ آپ کے فسانوں یا نظموں کے چھپے ہوئے کمالات پر غور کر سکیں یا بقول غالب

"آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا"

کے رمز سے کبھی واقف ہو سکیں۔ وہ تو صرف شراب اور عورت کو دیکھتے ہیں جن سے آپ کا کلام ملوث یا مزین ہوتا ہے۔

انقلاب دوستی یا ترقی پسندی کے یہ معنی کب ہوئے اور کیونکر ہوئے کہ فسق و فواحش اور قتل و غارتگری ہی زندگی کا حاصل ہے۔ یہ کیسا آرٹ ہے کون سا ادب ہے اور کس قماش کی زندگی ہے جس کا مرکزی اور بنیادی تصور فساد و فحاشی ہو۔ لکھنے کا کام میں نے بھی کیا ہے اور اس وادی کے بہت سارے پیچ اور پیچ اور پیچ و خم سے گزرا ہوں اور اب بھی گزر سکتا ہوں۔ میرے جیسے اور مجھ سے بہتر لوگ بھی موجود ہیں۔ میں نے انشاپردازی کی پیغمبری اور سپتے بازی دونوں دیکھی ہیں اور دونوں کو سمجھتا ہوں فحاشی اور عریاں طرازی نہ کوئی ادب ہے نہ کوئی آرٹ اور نہ کوئی زندگی۔ ہیں ادب آرٹ اور زندگی سب کو علیحدہ علیحدہ

اور بحیثیت مجموعی بھی صرف سلیقہ، شرافت اور سرفروشی سمجھتا ہوں حسن بن صبّاحیت
نہیں قرار دیتا (حسن بن صبّاحیت کی ترکیب پر نہ جائیے حسن بن صبّاح سے ڈریئے)
کہ آپ نوجوانوں کو سستا اور تیز نشہ پلا کر مصنوعی جنّت کی سیر کرائیں اور چن چن کر
بھلے مانسوں کا قلع قمع کرا دیں۔ صوفیائے کرام ہی نہیں انشا پرداز اور شاعر کے ہاں
بھی شریعت اور طریقت کی کارفرمائی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح نام نہاد
صوفیہ نے شریعت کو نظر انداز کر کے طریقت کو فروغ دیا ہے اور اس طرح
تصوف کو رسوا کیا اسی طرح جدید ادب کے اکثر حامیوں نے انشا پردازی کی
شریعت سے منہ موڑ کر صرف طریقت کو فروغ دیا اور انشا پردازی کی آبروریزی کی
میرا عقیدہ ہے کہ فحش ہی نہیں ہر بات اس طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مذاق
سلیم پر بار نہ ہو اور کسی کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اور غیر شاعر،
ادیب اور غیر ادیب ایک دوسرے سے علیحدہ اور ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے
ہیں۔ شاعر کا کمال یہی نہیں ہے کہ وہ ایسی بات کہے جہاں دوسروں کا ذہن نہ پہنچ
سکا ہو اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اس بات کو اس انداز سے اور ایسے
موقع پر کہے کہ وہ بات اس سے بہتر طور پر کہی یا پیش نہ کی جا سکتی ہو۔ یہ بات نہ ہوتی
تو سوسائٹی میں شاعر کو وہ درجہ نصیب نہ ہوتا جس پر بجا طور پر وہ ہمیشہ سے فائز
رہا ہے۔

محض بربنائے مثال قاضی عبدالغفار کی مشہور تصنیف لیلےٰ کے خطوط
اور سعادت حسن منٹو کے افسانے لے لیجئے۔ میں دونوں کو ترقی پسند ادیبوں
کے زمرہ میں رکھتا ہوں۔ سوسائٹی میں جنسی اشتہا کی تسکین کا جو وسیلہ عورت
کو قرار دیا گیا ہے اس کو دونوں بیان کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار عورت کی روح
کا کرب اور اس کی بغاوت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں اور جو چیز پیش کرتے

ہیں اس میں آرٹسٹ کا "دُہوترنگ" چھلکتا ہے۔ منٹو عورت کے بیان میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ وہ عورت کی زبونی اور درماندگی سے اپنی انشاپردازی کی دوکان سجاتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مشتبہ متاع چوربازار میں بیچنا بھی چاہتے ہیں اور اسی نوعیت کا مال چوربازار سے خرید کر اصلی بازار میں لانا چاہتے ہیں۔ آپ نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہوگا وہ ایک فرضی یتیم خانہ کے نام سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پھٹے پرانے کپڑے پہنا کر اور خلاکت و بے بسی کا سوانگ رچا کر کوچہ و بازار میں لئے پھرتے ہیں۔ کہیں خود روتے گاتے ہیں اور کہیں ان بچوں کو رلاتے گواتے ہیں۔ یتیم اور یتیمی کی اس نمائش کا مقصد صرف نفع کمانا ہوتا ہے نہ یہ کہ ان غریبوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ شاعری میں فیض احمد فیض اور میراجی کا موازنہ بھی بے محل نہ ہوگا لیکن یہاں ہر شاعر اور ادیب پر فرداً فرداً بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔

شاعرانِ انقلاب کا بھی یہی حال ہے، یہ انقلاب کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں جیسے آغا حشر کے ڈراموں یا اُن کے زمانے کے تھیٹروں میں ایکٹر غل غپاڑے کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک لندھور بن سعدان، قسم قسم کے رنگین بدصیتوں سے اپنے آپ کو جکڑے ہوئے، اسٹیج کے وسط میں نمودار ہوں گے، ہاتھ میں ابرک کا ایک گلاس لئے ہوئے (جس کے اندر موت کی شراب فرض کر لی گئی ہے) آنکھیں سُرخ اور ابلی ہوئی، مونچھیں ایسی کہ ان کو کسی تختی میں جڑ کے دیوار پر نصب کر دیجئے تو لوگ سمجھیں کہ آپ نے کوئی زبردست سینگدار جانور صحرائے افریقہ میں شکار کیا تھا اس کی یادگار رکھ لی ہے یا نخاس سے اونے پونے خرید لی ہے۔ سر چھوٹا پیٹ پھولا ٹانگیں تپلی آسمان کی طرف دیکھ کر کڑکیں گے۔ بادلو پھٹ جاؤ۔ آسمانو پھٹ جاؤ، فرشتو بھاگ جاؤ،

[illegible] جائے۔ اتنے میں گلاس کو نغمہ میں انڈیل دیں گے۔ آس پاس سے کوئی
ڈلا پھٹے گا جس کے دیسی بارود کی چکا چوند اور دھواں ہر طرف پھیل جائے گا۔ ساتھ
ہی ساتھ کھینچ تان کر آسٹیج کے پردے ادھر ادھر کر دیئے جائیں گے۔ ہیرو موت کی
گت پر (تال وسم کو پورے طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے) زمین پر آتے ہوئے نظر
آئیں گے۔ آخر میں ایک بار گی دھم سے گر کر سارے اسٹیج پر اس طرح لوٹ لگائیں
گے جیسے سڑک کوٹنے کا انجن رفتار اور حرکت دونوں اعتبار سے بے لگام ہو گیا
ہو۔ اس دوران میں کسی نے "ونس مور" (ایک بار پھر) نعرہ لگا دیا تو [illegible]
صاحبان پھر کود نے کڑکنے پر آمادہ ہو گئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انقلاب کو دعوت نہ دی جائے، جو غریب اس انقلابی
شاعری کو سہہ چکا ہو خود انقلاب اس کا کیا بگاڑے گا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے
۔ اس دنیا میں انقلاب کو جاننے پہچاننے والے ان شعرا کے علاوہ کچھ لوگ
اور بھی ہیں جنہوں نے انقلاب کو سستے دیسی تھیٹروں کے علاوہ اور اور مقامات پر
اور اور شکلوں میں بھی دیکھا ہے۔ انقلاب کوئی ٹونا ٹوٹکا نہیں ہے کہ آپ
عملیات پڑھ پڑھ کر اور بخورات سلگا سلگا کر اسے دعوت دیں۔ عورت کی
رٹ لگانا، خدا سے بیزار ہونا اور خود دونوں کے لئے باعث ننگ ہونا سمجھ
میں آنے کی باتیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی سمجھ سے باہر نہیں ہے کہ
اس سے روس انقلاب نہ بھیجے گا۔ صرف سوسائٹی لعنت بھیجتی رہے گی۔

نئے ادب کے شعرا اور ادیبوں کو مجھ سے یا میرے جیسے دوسروں سے
شکایت ہو سکتی ہے کہ ہم سب جس خدا، مذہب اور اخلاق یا زندگی کی دوسری
قدروں پر زور دیتے ہیں وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے ان معیاروں
پر ان کی ذہنی پیداوار کو پرکھنا بے انصافی ہے۔ لیکن یہ بات درست [illegible]

میں بذاتِ خود، مذہبیات کا ماہر نہیں ہوں اور نہ ہونا چاہتا ہوں۔ میں صرف مسلمان ہوں اور یہی رہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اپنی دانست میں اسلام سے منحرف ہوئے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی ہر قدر بمراتب زندگی ہی کی کسی نہ کسی سب سے بڑی قدر سے بر آمد ہوتی ہے اور اُسی قدر اعلےٰ وارفع سے اپنا جواز ثابت کرتا ہے طاقت پاتی اور مانی جاتی ہے۔ جس طرح کسی ملک کا قانون ملک کی سب سے بڑی طاقت سے خواہ وہ خارج میں موجود ہو یا باطن میں اپنا جواز ثابت کرتی ہے طاقت پاتی ہے اور طاقت دکھاتی ہے۔ میں خدا کے تصوّر اور وجود کو زندگی کی (خواہ وہ اس جہاں کی ہو خواہ کسی اور جہاں کی) بہترین اور اعلےٰ ترین قدر اور تصور سمجھتا ہوں چنانچہ میرے نزدیک خدا کا تصور وہ تصوّر ہے جس سے بڑا اور بہتر تصوّر انسانی ذہن و تخیل میں آ نہیں سکتا خواہ بڑے سے بڑا آدمی بڑے سے بڑے علم و فن کو اپنی امداد کے لئے پکارے یا بلائے۔ میں زندگی کی ہر قدر کو اسی بہترین اور اعلےٰ ترین قدر سے نسبت دینے ناپنے اور پرکھنے کا خوگر ہوں۔ نظر برآں اگر زید عمر بکر کسی مذہب کے بنائے ہوئے خدا سے انکار کریں تو یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے۔ جو بات کم سے کم میری سمجھ سے باہر ہے وہ یہ کہ خدا کے تصور اور وجود سے ہی انکار کیا جائے۔ کیا کوئی شاعر یا پڑھا لکھا مرد معقول ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اعلےٰ وارفع کا تصور کئے بغیر کوئی اعلےٰ درجہ کی چیز پیدا کر سکتا ہے؟ اور جس طرح کسی مذہب کی حقیقی روح کو سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے والا بمراتب قرآن سے قریب اور قریب تر ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ تصوّر کا خدا کے تصور سے قریب اور قریب تر ہونا لازمی ہے۔

یہاں پہنچ کر کہا جا سکتا ہے کہ میں یا میرے قبیل کے لوگ قدامت پرست ہیں اس لئے نئی تحریکوں کے ازلی دشمن ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ مجھے اس امر کا اقرار کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ میں قدامت پرست ہوں اور مجھے ترقی پسند

نہ ہونے کا بھی مطلق غم نہیں۔ اگر قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے معنی وہی ہیں جو نئے ادب کے علمبرداروں نے وضع کئے ہیں اور جن کا وہ ہر موقع پر مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کیا ہر نئی تحریک محض نئی تحریک ہونے کی بنا پر مبارک و مستند ہے اور کیا قدیم محض قدیم ہونے کی بنا پر مہمل و مزخرف ہے۔ زندگی میں اور اس کے ساتھ ساتھ ادب اور آرٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان تبدیلیوں کی بنا پر ان کو قدیم اور جدید کے خانوں میں بانٹ دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن زندگی میں اس لئے ادب و آرٹ میں کچھ constants (ابدی عناصر) بھی ضرور ہوتے ہیں جن کے بغیر نہ وہ مستند مانے جاتے ہیں نہ پروان چڑھتے ہیں اور نہ مفید ہوتے ہیں۔ ان ابدی عناصر کا قائل ہونا قدامت پرستی کی دلیل ہرگز نہیں ہے۔

یہ ابدی عناصر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایثار، عفت، صداقت، مروت، شجاعت، قناعت، وغیرہ پر جدید و قدیم کا اطلاق کب ہوا ہے۔ علاوہ بریں دنیا کا کوئی ادب و اخلاق ایسا نہیں ہے جہاں حرام و حلال کی تفریق اٹھا دی گئی ہو۔ دنیا کا کوئی آرٹ ایسا نہیں ہے جس کا مقصد حیوانی جذبات کی تحریک یا تسکین ہو اور ایسی کوئی زندگی انسانوں کی زندگی نہیں مانی گئی ہے جہاں حفظ مراتب کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ ممکن ہے کوئی شخص پرستش یا عبادت کا سرے سے قائل نہ ہو لیکن شرافت اس کو ماننے پر تیار نہیں کہ وہ کسی پرستشگاہ یا عبادت گاہ کو نجس کر دے اور اس کو اپنا حق سمجھے اور یہ محض اس لئے کہ عبادت گاہ کا یہ مصرف ہی نہیں ہے۔ چنانچہ آپ خدا کو نہ مانیں نہ سہی لیکن آپ اس کا مضحکہ نہیں اڑا سکتے اس لئے کہ مضحکہ اڑانے کا یہ مقام نہیں ہے۔

افراد کو یہ آزادی ضرور ملنی چاہئے کہ وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں لیکن یہ آزادی صرف ایسے لوگوں کا حق ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکتے ہوں ہماری سوسائٹی میں بہت سی خرابیاں ہیں ایسی خرابیاں جن سے روح لرزتی بھی ہے اور غضب ناک بھی ہوتی ہے۔ ان خرابیوں کو دور کرنا ہمارا اولین فرض ہے اور سب سے اہم فرض ہے لیکن یہ خرابیاں سڑے گلے زخموں کی نمایش یا اعلان سے دور نہیں ہو سکتیں۔ ان کا علاج بدچلنی اور یاوہ گوئی بھی نہیں ہے ان کا تدارک ہمیشہ صرف سرفروشی اور پاکبازی سے کیا گیا ہے۔ ہم قدامت پرست ہوں اور آپ ترقی پسند یا ہم ترقی پسند ہوں اور آپ قدامت پرست جس کا جو جی چاہے اپنے آپ کو یا دوسرے کو کہہ لے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ زندگی ادب اور آرٹ میں نجاست یا نحوست نہ آپ کو پھیلانے دیا جائے گا نہ ہم کو!

نئے ادب کی شاعری۔ قدیم اور قدیم شاعری دونوں سے بغاوت ہے اب تک اس کی حیثیت بغاوت ہی کی ہے۔ اس کا شعور اور اس کی پرداخت متین اور پختہ نہیں ہوئی ہے۔ باایں ہمہ اس میں جان ہے کمی صرف اتنی ہے کہ اس کے شعرا جذبات کے جتنے قائل ہیں اتنے ہی مقام شاعر سے بے خبر ہیں یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ذہنی خلفشار پر قابو نہیں پاتے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی دھندلکے میں اسیر ہیں اور نکل نہیں پاتے یا نکلنے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اس لئے کبھی تو وہ اسی دھندلکے کے مزے لینے لگتے ہیں یا پھر کھلی فضا، ہوا رنگ اور روشنی ہی کو قابل نفرت قرار دیدیتے ہیں۔ وہ ایک معمولی سی بات بہت دیر میں کہہ پاتے ہیں، اور اکثر کہکر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ شاید اس لئے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ نہ سکے۔ اس ضیق و فشار سے تنگ آ کر ان میں سے بعض بہکنے لگتے ہیں اور بعض بالکل ہی کھوئے جاتے ہیں

جیسے تصوف کی بھول بھلیوں میں جا پھنسے ہوں۔ یہی سبب ہے کہ وہ ایسے الفاظ عام طور پر استعمال کرنے لگے ہیں جو غیر متعین حالتوں پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً سایہ، پرچھائیں، گہری رات کی تاریکی یا سناٹا، مبہم، سرگوشی، سپنا، بیزاری۔ یا گھبرا کر انقلاب، خون، زنجیر، آگ، طوفان وغیرہ کے نعرے لگانے لگتے ہیں۔ وہ اتار اور یہ چڑھاؤ دونوں کوئی قابل اطمینان بات نہیں ہے۔ یہ علامات، مصطلحات، اشارے یا سہارے شاعر کی ذہنی تذبذب اور خلفشار کی غمازی کرتے ہیں۔

شاعر پر بحرانی نہیں کا ایسی حالت طاری ہے، اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ یہ شاعر اُس آگ پانی سے نہیں گذرے ہیں جس کا تذکرہ یہ اپنی شاعری میں کرتے ہیں اور جس کو یہ اپنے اوپر طاری کرنا یا رکھنا چاہتے ہیں۔ کابوس سے مجاہد کبھی متاثر نہیں ہوتا ہیٹ اور پیسے کے مریض اُس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان شعرا نے انقلاب دیکھا نہیں ہے اور نہ انقلاب کے جنتر سے نکلے ہیں یہ انقلاب کو لاٹری ہیں یا چھر باتر سے حاصل کرنا چاہتے ہیں کسی بڑھیا رشتہ دار کے ورثہ میں مل جائے تو ورا اچھا۔ شاعری بالخصوص نئی شاعری کا ابتدائی دور ایسا نہیں ہوا کرتا سادگی اور سلاست کا ہوتا ہے۔ خیال بندی، نفسیاتی تحلیل، نفسیاتی گہرائی جن کی یہ شاعری مدعی ہے بہت بعد کی چیز ہے۔ نئی شاعری میں شاعری کے آخری منازل (جس سے زوال کی سرحد ملی ہوتی ہے) کیسے راہ پاگئے۔ نئے شاعروں کو اس خطرہ سے آگاہ رہنا چاہیے۔

یہاں پر تھوڑی دیر کے لیئے میں اُس تحریک کو معرض بحث میں لانا چاہتا ہوں جو ادب، زندگی اور آرٹ میں خود اظہاری یا خود اظہاریت (سلف ایکسپریشنزم) کے نام سے موسوم ہے۔ افکار جدیدہ میں اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے مشہور چینی مصنف اور مفکر لین یُٹانگ نے اس تحریک کی وضاحت کرتے ہوئے بیان

کیا ہے کہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہی صحیح اور سچے جذبات کا اظہار کریں اور اس کا مطلق خیال نہ کریں کہ لوگ ہماری تعریف کریں گے یا ہمارا مضحکہ اڑائیں گے یا ہمارے اس فعل سے جدید یا قدیم اقدار و مسلمات کی توصیف ہوتی ہے یا تضحیک، تردید ہوتی ہے یا تصدیق۔ اس مسلک کے پیرو کو وہی باتیں اور چیزیں پیش کرنا چاہئیں جو براہ راست اس کے مشاہدہ یا تجربہ میں آئیں یا جن سے وہ براہ راست متاثر ہوا۔ اس طور پر اس مسلک کے پیرو ادب کے اس مانے ہوئے مفہوم کو پورا کرتے ہیں کہ ادب کا تنہا مقصد "اظہاریت" ہے اور ادبی حسن کا مدار اسی "اظہاریت" پر ہے۔

آگے چل کر وہ بیان کرتا ہے کہ اس اسکول کے خطرات بھی ہیں مثلاً اسلوب بیان سپاٹ، اور بے نمک ہو جائے، یا بے تکا پن آجائے یا جو لوگ یا جو باتیں مسلمہ و مستند مان لی گئی ہیں اُن سے شدید اختلاف پیدا ہو جائے۔ چنانچہ یہی اسباب تھے، جن کے بنا پر اس مسلک کے پیرووں کو اُن ناقدین نے بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جو قدیم تصور اخلاق کے دلدادہ تھے۔ لیکن یہ "اظہاریت" ہی کے علمبردار تھے جنہوں نے چینی افکار و تصورات کو یکسانیت اور موت کی زد سے نکال لیا۔ رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آجائے گا جب ناہمواریاں ہموار ہو جائیں گی اور کام چل نکلے گا۔ لن یٹانگ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ چین کا قدیم ادب در اصل مردہ ہو گیا تھا اس لئے کہ وہ اپنے مصنفین کے جذبات و افکار کے بجائے بزرگان باستان کے افکار و تعلیمات کا اظہار کرتا تھا۔ اور اظہاریت کا یہ دبستاں اس لئے زندہ ہے کہ وہ خود مصنفین کے ذہن و فکر کی ترجمانی کرتا ہے...... اگر جدید دبستاں کے پیرو قدیم تعلیمات یا قدما میں کوئی ایسی بات نہیں پاتے جو ان کے ضمیر کے منافی ہو تو یہ لوگ خواہ مخواہ قدما سے اختلاف نہیں کریں گے لیکن اگر ان کا ضمیر گواہی نہ دے تو

پھر ان کے ہاں قدما کے لئے کوئی جگہ نہیں . . . .

جدید اردو ادب کا مسلک وہی ہے جس کی وضاحت سطور بالا میں ملتی ہے۔ اس مسلک کے معقول ہونے نہ ہونے کا سوال اتنا اہم نہیں ہے جتنا اس سے کم سواد لکھنے والوں کے ناجائز فائدہ اٹھانے کا امکان اہم ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جو خود محسوس کرے اسی کا اظہار کرے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ادب ایک طرح کا اظہار ہی ہے جہاں ہمارے شعرا اور لکھنے والے اپنے فن و فکر کے حُسن و قبح کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اور اظہار مکمل نہ ہو تو ادب اور آرٹ کا مقصد ہی فوت ہوتا ہے۔ اصولاً یہ مسلک اپنی جگہ پر وزن اور وقعت رکھتا ہے لیکن سوال تو صفت، اس کے سلیقہ اور اس کے ضمیر کا ہے۔ جس شخص میں سلیقہ نہ ہو یا جس شخص کے ضمیر پر فخر نہ کیا جا سکے وہ اگر حریم ادب میں صرف برہنگی و بے باکی کا مظاہرہ کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کو "اظہاریت" کا دبستان ہی نہیں، غسلخانہ بھی قبول نہ کرے گا۔

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ آنکھ بند کر کے قدما کی پیروی نہ کرنی چاہئے اس سے افراد کی قوت اختراع زائل ہوتی ہے اور تخلیقی کارناموں کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی کوئی نئی بات نہیں ہے کہ قدما کے ہاں کافی لغزشیں ملتی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے پچھلے اوراق میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ فحاشی وہ "گناہ" ہے جس کا قدما کے "شہر" میں بھی ارتکاب کیا گیا ہے لیکن اس سلسلہ میں جن بڑے آدمیوں کے نام پیش کئے جائیں گے ان کا آپ سرسری نظر سے بھی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے ہاں فحاشی یا بدمذاقی مقصود بالذات نہ تھی۔ وہ فحش کو آرٹ کے پردہ میں بھی مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے مشن یا کمال کو فحاشی یا بدتمیزی کی بنا پر قابل فخر نہیں سمجھتے تھے اور نہ اسی بنا پر اپنی عظمت منوانا چاہتے تھے۔ اور جو

لوگ نری بے حیائی اور فحاشی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے ان کو عزت و احترام کی نظر سے نہ جب دیکھا جاتا تھا نہ اب۔ مذہب اور اخلاق کے بارے میں بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ بدلتے رہتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کے نام پر زیادتیاں بھی خوب خوب کی گئی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذہب اور اخلاق کے بنیادی حرام و حلال کس طرح ترقی یافتہ زمانے میں ایک دوسرے کی جگہ لے لیں گی۔ مذہب اور اخلاق کی آڑ میں جو ظلم توڑے گئے ہیں اُن سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ مذہب و اخلاق سرے سے ناقص ہیں۔ یا چونکہ مذہب و اخلاق کی وجہ سے ظلم کو فروغ ہوا ہے اس لئے شعر و ادب کی وجہ سے بھی ظلم کو فروغ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

چین کے جن نوجوان ادیبوں نے چین کے شعر و ادب کو فرسودہ ہو کر مٹ جانے سے بچا لیا وہ ہر طرح تعریف کے مستحق ہیں لیکن شعر و ادب کو فرسودگی سے نکال کر نئی زندگی بخشنا وہ سہرا نہیں ہے جو صرف چین یا کہیں اور کے نوجوانوں ہی کے سر بندھا ہو۔ اُردو میں اس کا سہرا بوڑھوں کے سر بھی بندھ چکا ہے۔ بوڑھے سرسید، بوڑھے حالی، بوڑھے آزاد، بوڑھے شبلی، بوڑھے نذیر احمد، بوڑھے ذکاء اللہ کے کارناموں سے ہم میں کون واقف نہ ہوگا۔ انہوں نے اردو شاعری اور انشاپردازی کی ساخت و پرداخت ہی نہیں بدلی بلکہ اس کو نئے ولولے نئی ادائیں اور نئے ساز و سامان بھی بخشے۔ ان کو جانے دیجئے ان کے بعد والوں کو لے لیجئے۔ جو اصطلاحاً ترقی پسند نہ کہلائے لیکن ان میں ترقی کے وہ تمام جوہر ملتے ہیں۔ جن کا دعوے آج ترقی پسند ادب کو ہے۔ انہوں نے اردو انشاپردازی کو جس طرح مقبول بنایا اور آبرو بخشی اس کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے مثلاً پریم چند، قاضی عبدالغفار، سلطان حیدر جوش، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور دوسری لوگ میں تو یہاں تک مانتا ہوں کہ خود ترقی پسند ادب میں ایسے لکھنے والے ملتے

ہیں جن کی میں عزت کرتا ہوں۔ وہ زندگی کی پاکیزگی اور برگزیدگی کو ملحوظ رکھتے ہیں اور رسوا کرنے یا رسوا ہونے میں کوئی بڑائی نہیں دیکھتے، مثلاً اختر انصاری، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری اور اس قبیل کے اور دوسرے لوگ۔ یہ زندگی کو اس کے مجموعہ میں دیکھتے ہیں اور زندگی اور فن دونوں کا احترام کرنا جانتے ہیں ان کا ہنر ان کا خلوص ہے اور ان کا خلوص ان کا ہنر، یہی وہ ہنر ہے جو حسن بن کر سامنے آتا ہے۔

ترقی پسند ادیب کو محض اصطلاح بن کر نہ رہنا چاہیئے اس کو دواوین کی تنگنائے سے نکل کر زندگی کی وسعتوں پر محیط ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے ہوا خواہ یہ رمز سمجھ لیں گے کہ جوانی کے معنی شہوت اور شہد پن کے نہیں ہیں یا ہوں گے بھی تو طب اور تعزیرات ہند میں ہوں گے۔ زندگی ادب اور فن میں جوان وہ ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

ترقی پسند ادیبوں کو چاہیے یہ بات بھائے یا نہیں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کو اپنے لکھنے والوں پر کسی نہ کسی قسم کا ضرور احتساب رکھنا چاہیئے۔ ان کی ایک اکاڈمی ہونا چاہیئے جو لکھنے والوں کو قابو میں رکھے ہدایت بھی دے اور ان کی ہمت افزائی بھی کرے۔ ادب انسانیت سے خارج نہیں ہے اور انسانیت کوئی ایسا مفہوم نہیں ہے جس کو آپ کچھ اور سمجھتے ہوں ہم کچھ اور۔ انسانیت کو انسانیت ہی کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں!

نئے ادب اور نئے ادیب کے بارے میں میں نے جو کچھ کہا ہے یا دوسرے جو کچھ کہتے ہیں اس کا سلسلہ تو کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ جاری رہے گا۔ ادب کی زندگی

میں یہ منزلیں ضرور پیش آتی ہیں۔ ادب کو اگر ہم ایک ذی حیات جسم مان لیں تو اس قسم کی بحثیں بمنزلہ تنفس کے ہیں جس پر ادب کی زندگی کا مدار ہے جس سے گھبرانا نہ چاہئے البتہ خود تنفس کے انداز و رفتار پر نظر رکھنی چاہیئے۔ اب تھوڑی دیر کے لئے بقول غالب روئے سخن صاحبِ عالم کی طرف ہے، صاحب عالم سے یہاں مراد پرانے ادب اور اس کے علمبرداروں سے ہے۔

نئے ادب کو بُرا بھلا کہنے میں ہم کو جو مزا آتا ہے اتنا پرانے ادب کے اچھے سے اچھے نمونوں کے پیش کرنے کی ہم کو جراٴت یا توفیق نہیں ہوتی۔ اس سے پرانے ادب کے پیروؤں کی ہمت اور نیت دونوں کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو چلی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی پر ان دنوں شدید بحران طاری ہے یہاں تک کہ ہمارے اچھے اچھے لوگوں کو بھی سوجھتا نہیں کہ کدھر جائیں اور کیا کریں۔ میں موجودہ زندگی کے مسائل اور مصائب کو نام بنام تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ اس درجہ واضح ہیں اور ان میں ہم اس درجہ گھرے ہوئے ہیں کہ تشریح کی احتیاج نہیں ہر مصیبت کو نظر انداز کر کے اس وقت صرف بنگال کو ہلاک ہوتے ہوئے دیکھئے۔ میں نے ملکہ وکٹوریہ کا بھی عہد دیکھا ہے اور جمعیتہ الاقوام کے زیر سایہ بھی رہا ہوں اور اٹلانٹک چارٹر کا خواب بھی دیکھنے سے باز نہ آؤں گا۔ اب سے پہلے میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ قحط میں مسلسل اور منظم طور پر لوگ مریں گے اور ہم صرف رزولیشن پاس کرتے رہیں گے۔ اس وقت دنیا کی کون سی طاقت دنیا کے کون سے ذخائر اور دنیا کے کون سے وسائل اور اخلاق و مذہب کے کون سے صحائف سماوی یا ارضی یا ان صحائف کے کون سے پیرو موجود نہیں ہیں لیکن بوڑھے، جوان، بچے، مرتے ہی چلے جا رہے ہیں، عورتیں اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی بچے اور عصمت، نوجوان اپنی حمیت و حرارت، بوڑھے اپنی وضع اور اپنی روایات سب کچھ حوالہ کر دینے پر تیار رہتے

ہیں لیکن پیٹ کے لئے ٹکڑا اور تن کے لئے چیتھڑا میسر نہیں۔ ہم میں سے اکثر اپنے آپ پر دفعتاً وہی حالت طاری پاتے ہوں گے جو اس مصرع کے مصنف پر ممکن ہے طاری رہی ہو۔

"ایں کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب"

اب مجھے پرانے ادب کے علمبردار بتائیں کہ انہوں نے کچھ اور نہیں تو بنگال کے اس زلزلہ پر کیا لکھا کیا پڑھا اور کیا پیش کیا' ذہنی دنیا میں رہنا یا داخلی شاعری کی آڑ پکڑنا میرے نزدیک بیکار ہوتا ہے اگر شاعر اپنے آپ کو خارج سے بے نیاز کرے اور خارج کو توڑنے مروڑنے اور سلجھانے سنوارنے میں خون پسینہ ایک نہ کر دے یا نہ کر سکے۔ مجھے شرم آتی ہے جب میں ان جدید یا قدیم شعرا کو دیکھتا ہوں پڑھتا ہوں جو دلفی کے کاہنوں کی طرح ہم کو صرف شگون اور علامات سے مشتبہ بشارتیں پہنچاتے رہتے ہیں۔

"پرانے چال کے لکھنے والوں کو نئے چال کے لکھنے والوں سے بدظن یا برہم ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر ادل اندکر زندگی کے موجودہ مسائل کو نوجوانوں کے سامنے بطریق احسن نہیں پیش کر سکتے نظم افسانہ ڈراما وہ اسالیب نہیں ہیں جو صرف ترقی پسندوں نے ایجاد کئے ہوں یا جن کے وہی اجارہ دار ہیں یا یہ اسالیب بجائے خود مذموم ہوں۔ پرانے لکھنے والے بھی ان مقبول اسالیب کو اختیار کر سکتے ہیں اور انہیں میں اپنے بہترین خیالات پیش کر سکتے ہیں ان کو ایسا کرنا بھی چاہئے کچھ اور نہیں تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ پرانے لکھنے والوں کے ذہنی سوتے خشک نہیں ہو گئے ہیں اور وہ اس فن میں بھی اپنا رتبہ قائم کر سکتے ہیں اور رکھ سکتے ہیں۔ اگر نئے ادب والے فحش نگار اور عریاں طراز ہیں تو پرانے ادب والوں کو چاہئے کہ وہ طعن و طنز و سب و شتم کے بجائے ایسے افسانے لکھیں جو عریاں اور فحش بھی نہ ہوں اور تاثیر میں بھی کم نہ ہوں میں سمجھتا ہوں کہ پرانے ادب کے پیروؤں کو بھی دنیا کے موجودہ مسائل اور مصائب کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھنا اور اس کا حل پیش کرنا چاہئے۔ جیسا کہ بھلا یا برا نئے ادب والے کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو ان کو اس کا بالکل حق نہیں کہ وہ ترقی پسند ادب کو ہدف ملامت بنائیں۔ زہریلی گیس سے مقابلہ اب ممنوع ہو گیا ہے۔

نیا ادب میری نظر میں

سیماب اکبر آبادی

نام نہاد "ادب جدید" پر اب تک میرے قلم سے متعدد مضامین نکل چکے ہیں۔ مگر آغا سرخوش صاحب کا مسلسل تقاضا ہے کہ میں اس موضوع پر کچھ اور لکھوں۔ موضوع بجائے خود نہایت دلچسپ ہے۔ جس نے ادب کے پرانے موضوعات میں یک گونہ تنوع پیدا کر دیا ہے۔ اور اب کوئی رسالہ شاید ہی ایسا شائع ہوتا ہو جس میں کسی نہ کسی پہلو اور کسی نہ کسی عنوان سے "ادب جدید" پر بحث نہ ہو جاتی ہو۔ لیکن جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے۔ ابھی تک اس موضوع پر کوئی فیصلہ کن مضمون نہیں لکھا گیا۔ اور نہ آئندہ اس کی امید ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے "نئے ادب" کی بدعت کو اپنانے میں خاصی دلچسپی سے کام لیا ہے۔ چمکیلے شاندار عنوانوں سے اسے ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور لکھوائے ہوئے "کل جدید لذیذ" ناظرین رسائل کو بھی نئے ادب میں نیا مزا آنے لگا ہے۔ اس لئے اب یہ اندیشہ یقین سے بدلتا جا رہا ہے کہ "نیا ادب" بھی "قدیم ادبی اسالیب" کے ساتھ ساتھ غالباً کچھ زمانے تک سانس لیتا رہے گا۔ اور اسے مٹا دینا یا دبا دینا شاید ممکن نہ ہو۔

"نیا ادب" میری نظر میں کوئی اختراعِ فائقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہنگامی اور ہیجانی چیز ہے۔ جو اپنے دورِ آغاز میں جتنی اندیشناک تھی اتنی اب نہیں رہی ہے۔

برابر دیکھ رہا ہوں کہ حامیانِ ادبِ جدید ثقافت تنقیدوں اور منتخب تبصروں سے متاثر ہو کر اپنے راستے متعین کر رہے ہیں۔ اور وہ بے راہ روی جو قدم اٹھاتے ہی محسوس ہوتی تھی، رفتہ رفتہ سلامت روی سے بدلتی جا رہی ہے، تھوالمقصود میں نے اپنے کسی مضمون میں عرض کیا تھا کہ جب تک کسی نظریہ کا ایک اصول اور ایک نصب العین متعین نہ ہو، اس نظریہ کی کامیابی مشکل ہے۔

آزاد نظموں میں، بحرانی تجربے۔ فضول نعرہ بازی، سطحی رومانیت، نام نہاد جدیدیت، ابہام، اہمال، چونکا دینے والے موضوعات۔ عریاں خیالات کا جو انبار نظر آتا تھا۔ وہ کچھ گھٹ چلا ہے اور حامیانِ ادبِ جدید سمجھ گئے ہیں کہ یہ زمانہ کوہ آتش فشاں کی طرح ایک دم پھٹ پڑنے اور پھر صدیوں لاوے کی طرح رینگتے رہنے کا نہیں ہے۔ بلکہ سلامت روی رفتارِ آبشار کی تقلید ہے یعنی آہستہ آہستہ، مترنم طریقے سے بہنا۔ بہتے رہنا۔ اور بہنے سے کبھی نہ تھکنا۔

فردا کا خاموش دھندلکا، ماضی کی گھنگھور سیاہی
یہ خاموشی یہ سناٹا، اس پر اپنی کور نگاہی
جیون کی پگ ڈنڈی یونہی تاریکی میں بڑھ جاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

سبحان اللہ۔ اس پہ کون اعتراض کر سکتا ہے۔ چاروں مصرعوں میں ایک بحر قائم ہے۔ قوافی بھی موجود ہیں۔ رجحان میں نیا پن بھی ہے۔ "جیون کی پگ ڈنڈی" پہ بھی اردو پرست طبقوں کو اعتراض کا موقع نہیں۔ ہندی بھی ہمارے ہی ملک کی زبان ہے۔ اگر ادب کا یہ کاردان تو کچھ ہندی الفاظ آسانی اور خوبی سے نظم کر جاتا ہے تو کرنے دیجئے اگر وہ ہندی الفاظ میں حلاوت محسوس کرتا ہے تو بہ نظر

اختلافِ طبائع آپ بُرا ماننے والے کون ؟ آپ بھی جب عربی اور فارسی الفاظ سے
اپنے اشعار میں شکوہ پیدا کرتے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں ٹوکتا۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ
"پگڈنڈی" عام بول چال کا لفظ ہے۔ میں بھی موقع محل سے بولتا ہوں اور آپ
بھی۔ پھر اس نوجوان یا نئے ادیب نے اگر اس لفظ کا استعمال کیا تو کیا بُرا کیا ؟
جہاں اس نے ہندی کے چار لفظ استعمال کئے ہیں، وہاں فروا۔ ماضی۔ سیاہی،
خاموشی، کور نگاہی۔ تاریکی اور راہ جیسے سات، آٹھ لفظ فارسی عربی کے بھی نظم
کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ "جیون کی پگڈنڈی" کی جگہ خالص اردو کا کوئی متبادل
ٹکڑا آتا بھی تو نہیں۔ البتہ راہ میں ستارے چھو لینا یا نہ چھو سکنا محل نظر ضرور ہے
فضائے آسمانی میں اُڑتے اُڑتے یہ خیال پیدا ہوتا تو زیادہ موزوں تھا۔ لیکن یہ
بھی محرومیٔ رفعت کا ایک کنایہ ہے۔ جو شاعرانہ انداز میں گوارا معلوم ہوتا ہے
ایسے ہی تین شعر اور سنئے :۔

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
اُن کے قدموں پہ مچلنے لگے بیتاب ساخوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں!
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت نہ کروں

قوافی کی بے ترتیبی کے باوجود جس احساس کی ان مصرعوں میں ترجمانی کی گئی
ہے وہ میرے نزدیک بہت زیادہ قابلِ قدر ہے اور بحر بھی موجود ہے۔ اثر
بھی ہے۔ اور مآل بھی۔ اگر ایسے ہی اسلوب پر جدید خیالات نظم کئے جائیں تو
ادبِ جدید سے متفق ہوں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ بے ضابطگی صرف چند نوجوان
شعرا میں پائی جاتی ہے۔ اور معتد بہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو "نئے ادب" کو دانستہ

"ست نجا" بنا رہے ہیں۔ اور جن کی بکواس "مجذوب کی بڑ" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مثلاً۔ میں صرف ایک ہی نظم کا تجزیہ مختصراً آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں:۔

میں تھکا ماندہ مسافر ہوں چلا جاؤں گا
ایک گھڑی راہ میں تم مجھ کو بسر کرنے دو
ایک ہی پل کے لئے۔ چاند۔ ستارے۔ بادل
پھیلے آکاش پہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں
ایک ہی پل کے لئے راہ میں ہر پیڑ کی چھاؤں بھی گھنی ہوتی ہے
زیست کی راہیں ایک پل کے لئے ایک اشارہ سا کئے جاتی ہیں
جیسے ناٹک میں کوئی آتا کوئی جاتا ہے
صاف کہتے نہیں لیکن پھر بھی
انکے ہر ایک اشارے کا یہ مطلب ہے کہ پل بھر کو مسافر ٹھہرے
ایک ہی پل کا تماشا ہے یہاں
ایک پل جان کے انجان تو بن سکتے ہیں
اور اگر عمر کا ہو ساتھ، زمانہ آئے
آئے آتے ہی چلا جائے تو پھر یوں سمجھو
جانی پہچانی ہر اک بات ہوا کرتی ہے
جانی پہچانی کسی بات سے کیا رغبت ہو
پل کا جادو ہے انوکھا جادو
نت نئی باتوں کو لے آتا ہے
اور چپکے سے چلا جاتا ہے

ایک پل شرم کا دشمن ہے کہ جیسے کبھی خلوت سی کوئی دوشیزہ
پیرہن سیج پہ رکھا ہے ذرا ستا دے، باہر آئے

اور باہر ہو ہجوم
اپنے حلقے سے نکلتی ہوئی آنکھوں کا ہجوم

اور وہ عریاں عورت
بڑھتی ہی جائے نہ رکنے پائے
اس کو کچھ سوچ نہ آئے کہ یہ بیتاب ہجوم
میرے پیچھے اگر آیا تو میں مٹ جاؤں گی
ایک پل ایسے ہی آتا ہے چلا جاتا ہے
تم بھی یہ چاہتی ہو یوں بڑھ جاؤ
ایک ہی پل کے لئے پاس آؤ
لیکن افسوس مجھے عمر کا ہی ساتھ پسند آتا ہے
جانی پہچانی کسی بات سے رغبت ہی نہیں ہے تم کو
تم کو ہر راہ میں انجان ملا کرتے ہیں
کیا نگاہوں میں تمہاری آکاش
کوئی تاریک نہاں خانہ ہے
جس کی تاریکی میں اک پل کے لئے چاند، ستارے، بادل
جیسے آتے ہیں چلے جاتے ہیں
ایک پل ٹھہرو ذرا ایک ہی پل
اک کرن جاگی ہے تاریکی میں
گر کوئی چاند، ستارا، بادل

چلتے چلتے ہوئے بہتے ہوئے چاہے کہ اسے ایک ہی پل کا آغوش
دامنِ عمر کے پہلو میں سلا دیتے تو یہ ناممکن ہے
وہ بھی اک پل کے لئے آئی تھی
ایک پل آیا گیا
اور وہ ساتھ گئی
لو اکرن شمع بجی
کیوں تھکا ماندہ مسافر ہی کہیں راہ میں رہ جاتا ہے
میں وہ پژمردہ مسافر تو نہیں
میں ہوں اب ایک ہجوم
اپنی ناکام تمناؤں کا بیتاب ہجوم
دل کی دھڑکن جیسے کہتی ہے وہ پل بیت گیا۔ بیت گیا۔ بیت گیا۔
اور یہ پل بھی چلا جائے گا۔
پیرہن بیچ پہ رکھ دو، دراستادہ سے باہر آؤ
اک گھڑی درد کے تاریک نہاں خانے میں
تم سے مل کر ہی بسر کر لوں گا
میں تمہیں چاند سمجھ لوں گا۔ چمکتا ہوا چاند
اور پھر دل کو یہ سمجھاؤں گا۔ تو بادل ہے
ایک ہی پل کو برستا بادل
تجھے اک پل کو برستے ہوئے مٹ جانا ہے

پہلے نظم کی داخلی ہیئت پر غور فرمائیے۔ نظم کا عنوان ہے "دوسری عورت سے"
شاعر اس دوسری عورت سے خطاب کر رہا ہے۔ اس کی پہلی عورت غالباً

اُس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اور یہ کوئی دوسری عورت راہ میں ملی ہے جس سے وہ پہلے نفرت کرتا ہے اور پھر مانوس ہو جاتا ہے۔ اُس کے تصور میں ماضی کی فنا ہو جانے والی ساعتیں بادل اور چھاؤں کی صورت میں مرتعش ہوتی ہیں۔ لیکن اسی بادل اور چھاؤں میں جذبات کی ایک کرن بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور شاعر دوسری عورت کو چاند سمجھ کر اپنے دل میں بسا لینا چاہتا ہے۔ چاہے یہ آبادی ایک پل کے لئے کیوں نہ ہو۔ اور یہ پل بھی ماضی کی ساعتِ رفتہ کی طرح دفن کیوں نہ ہو جائے۔

اس نظم کا یہ مفہوم جو نظم کی سطحِ کثیف سے کائی چھانٹ کر نکالا گیا ہے، کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن خیر کچھ نہ کچھ مفہوم نکل آتا ہے۔ تاہم مقصدِ نظم غیر اخلاقی ہے۔ اور نظم کے مآل و مفہوم سے ہم کوئی ایسی بات اخذ نہیں کر سکتے جو موجودہ نژادِ نو کے لئے مفید یا کارآمد ہو۔

ادبِ جدید کا یہ دعویٰ کہ وہ وقت کے تقاضوں کی آواز ہے۔ اس نظم کے پڑھنے اور سمجھنے سے باطل ہو جاتا ہے۔ اور بجز اس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ شاعر ایک عورت کو کھو کر دوسری عورت سے حظِ نفس حاصل کرنے کے لئے حیلے تلاش کرتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ کے غازے سے اپنے ارادوں کی تصویر کو دیدہ زیب و خوش رنگ بنانا چاہتا ہے اور بالآخر خواہشِ نفسانی سے مغلوب ہو کر "دوسری عورت" کو دعوتِ خلوت دے دیتا ہے۔

تو کیا یہی وقت کا تقاضا ہے؟ اور کیا ایک نوجوان ناظرِ نظم کے جذبات میں اس نظم کے پڑھنے سے کوئی اچھا اور نیک خیال پیدا ہو سکتا ہے؟

اب اس نظم کی لسانی و ادبی قیمت دیکھئے۔

"پھیلے آکاش" ——— آکاش یعنی آسمان کی صفت "پھیلے" یعنی کشادہ

کوئی نئی اور بلند صفت نہیں آسمان فطرتاً کشادہ ہے۔ تو پھر ایک کشادہ چیز کو کشادہ کہنا تحصیل حاصل کے سوا اور کیا ہوا؟ صاحبِ نظم کو ہندی الفاظ سے اُنس ہے یہ کوئی بری بات نہیں۔ لیکن اچھی بھلی اردو زبان میں نظم کہتے کہتے خواہ مخواہ ایک ہندی کا لفظ رکھ دینا۔ ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ اگر "پہلے آکاش" کی جگہ "آسمان پر یونہی" لکھ دیا جاتا تو بے محل اور ضعیف صفت بھی نہ رہتی اور ہندی اردو کا اختلاط گنگا جمنی کی سے قے بھی نہ معلوم ہوتا۔

آگے چلئے۔ چھاؤں۔ بروزن "فعلن" جہلا کا مختار ہے۔ چھانوں۔ گانوں۔ پانوں۔ ثقہ شعرا ہمیشہ بروزن "فاع" لکھتے آئے ہیں۔ ؏

"بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھانوں گھنی ہوتی ہے"

صاحبِ نظم بھی چھانوں بروزن فاع ہی بولتے ہیں۔ تو پھر اسے "فعلن" کے وزن پہ نظم کرنا عجز طبیعت ہی ہو سکتا ہے۔

"وا استادہ" یعنی چہ۔ کھڑا ہوا دروازہ۔ یہ آج ہی سنا ہے۔

"اُس کو کچھ سوچ نہ آئے" محاورۂ اردو نہیں ہے۔ "اور اتنا بھی نہ سوچے کہ یہ بیتاب ہجوم" لکھنے میں کیا گناہ تھا؟

"تم بھی یہ چاہتی ہو یوں بڑھ جاؤ" ——— "یوں بڑھ جاؤ" کیا بات ہوئی — "تم بھی یونہی بڑھنا چاہتی ہو" کہنا چاہیئے تھا۔ مگر کہہ گئے "یوں بڑھ جاؤ" سبحان اللہ۔ پہلے مصرع میں "جاؤ" بروزن فاع اور دوسرے مصرع میں "آؤ" بروزن "فعلن" نظم ہوا ہے۔ یہ فنِ عروض کے خلاف تو ہے ہی مگر نظم کی موسیقی بھی اس سے غارت ہو جاتی ہے۔

"عمر کا ہی" کی جگہ "عمر ہی کا" ہونا چاہیئے

"آکاش" پھر آیا ہے۔ حالانکہ "یہ فلک" کہہ سکتے تھے۔ اور اس طرح "تاریک

نہاں خانہ" کی ترکیب سے اس لفظ کا میل ہو سکتا تھا۔

"سُلا دیتے" غالباً "سلا دے" کی جگہ کاتب نے غلط لکھ دیا ہے۔

"تجھے اک پل کو برستے ہوئے ہٹ جانا ہے" "پل کو" کی جگہ "پل بھر" ہونا چاہیئے۔

اب فنی نقطۂ نگاہ سے نظم کو پرکھئے۔ حالانکہ "ادبِ جدید" کے حامی اس نقطۂ نگاہ کو تسلیم نہیں کرتے لیکن میرا مقصد اس سے کچھ اور ہے۔ نظم کے بیشتر حصے "مفعلاتن مفعلاتن مفعلاتن فعلن یا فعلان" کے وزن پر ہیں۔ اگر پوری نظم اس بحر میں ہوتی تو پڑھنے میں بھی آسانی ہوتی اور موسیقی بھی قائم رہتی۔ مگر آزاد نظم ایک خودرو بیل کی طرح کہیں کم اور کہیں زیادہ پھیلی ہوئی نہ ہو تو پھر اسے "نظم آزاد" کون کہے

"دل کی دھڑکن جسے کہتی ہے وہ پل بیت گیا۔ بیت گیا۔ بیت گیا"

یہاں "دل کی دھڑکن جسے کہتے ہیں" ہونا چاہیئے۔ بات "وہ پل بیت گیا" پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور مصرع ایک وزن میں پورا ہو جاتا ہے۔ مگر "نظم آزاد" کا ضابطہ پورا کرنے کے لئے "بیت گیا۔ بیت گیا" دوبارا اور بڑھا کر مصرع کی موزونیت کا دانستہ کٹا کر دیا گیا ہے۔

اسی نظم میں دو باتیں شاعرانہ انداز میں خوب لکھی گئی ہیں:-

اور باہر ہوا ہجوم،
اپنے حلقوں سے نکلتی ہوئی آنکھوں کا ہجوم

ہجوم کی تصریح بہت شاعرانہ ہے۔ اسی طرح آگے چل کر:-

میں ہوں اب ایک ہجوم،
اپنی ناکام تمناؤں کا بے تاب ہجوم،

یہ اندازِ تشریح بھی شاعرانہ ہے۔

یہ تھا ایک "نظمِ آزاد" کا تجزیہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر نظمِ آزاد لکھنے والے فنّی، لسانی، اور علمی و ادبی مسامحات سے اپنی نظموں کو محفوظ رکھیں۔ اور اچھے مفید خیالات مفید بات کی ترجمانی کریں تو ان پر پھر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

ہمارے وہ نوجوان شاعر جو قواعدِ زبان اور فنِّ شاعری سے بہرہ مند نہیں ہیں اگر صرف موسیقی ہی کے خیالات رکھیں تو ان کے افکار میں بڑی حد تک موزونیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کی مثالیں ادبِ جدید میں اکثر ملتی ہیں۔ لیکن سب سے بڑا عنصر اس نام نہاد ادب کا عریانی اور جنسی بھوک ہے۔ فیصدی اسّی نظمیں ایسی ہی ہیجان آفریں موضوعات پر کہی جاتی ہیں اور اسی لئے لوگ انہیں دلچسپی سے پڑھتے اور سنتے ہیں؛ گو "نیا ادب" موجودہ نسل کے نوجوانوں کے لئے ایک نیا "کوک شاستر" تالیف کر رہا ہے۔ اور اسی لئے وہ ثقہ اور محتاط شعرا کی نظر میں مردود ہے۔

"یہ جدیدیت"، جو نئے ادب کی موزوں اور غیر موزوں نظموں میں پائی جاتی ہے انگریزی ادب سے مستعار ہے۔ بعض نظموں میں مغربی لٹریچر کے خیالات ہیں۔ اور بعض نظمیں انگریزی نظموں کا ترجمہ ہیں۔ چنانچہ سردار انور کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر "تاثیر ایم اے" کی دو مشہور نظمیں "رات کی ہیں ہزارہا آنکھیں" اور "اٹھ جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے" علی الترتیب ایف ڈبلیو بورڈلن اور فٹز جیرلڈ کی نظموں کا لفظی ترجمہ ہیں۔ یہ دونوں نظمیں مع اصلی نظموں کے شائع کر دی گئی ہیں۔

خدا رحم کرے مشرق کے نوجوانوں پر۔ اور انہیں توفیق دے کہ وہ اپنے علم اور فکر و نظر سے تخلیق و اختراع کا کام لینا سیکھیں۔ اور "کلاغ" کی طرح "کبک" کی نقل کر کے اپنی رفتار بھول جانے کے الزام میں بدنام نہ ہوں۔

نیا ادب میری نظر میں

فیض احمد فیض

میری نظر میں ادب کی صرف دو قسمیں ہیں، اچھا ادب اور برا ادب، یہ دونوں قسمیں ہر دور اور ہر زمانہ میں موجود تھیں اور آج بھی موجود ہیں، پرانے زمانہ میں اگر نصف درجن ایسے اساتذہ تھے جن کا کلام آج تک مقبول ہے تو ان گنت ایسے یاوہ گو بھی تھے جنہیں گمنامی نگل چکی ہے۔ یہی صورت آج کل بھی ہے گنتی کے اچھے لکھنے والے بھی ہیں اور ان گنت پوچ نویس بھی، پھر یہی نہیں کہ ہر دور میں تمام لکھنے والے یکساں طور پر اچھے نہیں ہوتے، بلکہ ہر لکھنے والے کی تمام تحریریں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں، کچھ اونچ نیچ ان میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً غالب کے دیوان میں (اور یہ دیوان غالب کا سارا کلام نہیں انتخاب ہے) ایسے شعر بھی ملتے ہیں۔

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔۔۔ کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

لیکن جس طرح ہم کسی ادیب کا رتبہ طے کرتے وقت اس کی بدترین تحریریں نہیں بلکہ اس کی بہترین تحریریں سامنے رکھتے ہیں۔ اسی طرح کسی دور یا کسی تحریک کی خوبیاں اور برائیاں جانچنے کے لئے اس کے بدترین تحریری نمونے نہیں بہترین نمونے سامنے رکھنے چاہئیں۔ یہ کوئی عالمانہ نکتہ نہیں۔ بالکل مبتدیانہ بات ہے۔ حیرانی ہے کہ نئے ادب کے نکتہ چین نقاد کے اس بالکل ابتدائی کلیہ سے بھی آگاہ نہیں۔ یا آگاہ ہیں اور عمداً اس پر عمل نہیں کرتے، شکایت اُن ادبی لال بجھکڑوں سے نہیں ہے جو راشد کے کلام کو میراجی یا مجاز کے کلام کو محمود جالندھری کے کلام سے تمیز نہیں کر سکتے، شکایت اُن ثقہ نقادوں سے ہے جو چند اچھے لکھنے والوں کے معترف بھی ہیں لیکن اس کے باوجود

جب بھی نئے ادب کے بارے میں کچھ لکھیں گے اُن اچھے لکھنے والوں کو ایک آدھ جملے
میں ٹال کر اپنا سارے کا سارا زورِ قلم گھٹیا لکھنے والوں کی خدمت میں صرف کر دینگے
ان کے تنقیدی مضامین کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے "نیا ادب فحش ہے عریاں ہے
بد زبانی ہے، اس میں خلوص اور حسن کی کمی ہے، اغلاط اور خامیوں کی افراط ہے، ہاں
اکّا دکّا اچھے لکھنے والے بھی ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے" یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہیں
کہ میر کا کلام پست ہے، غیر دلچسپ ہے، اس میں تک بندی افراط اور خالص شاعری کی
کمی ہے، ہاں اس میں کہیں کہیں نشتر بھی ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے" یہ کہیں کہ
پرانی غزلیہ شاعری فحش ہے، مبتذل ہے تصنع اور تکلف سے بھرپور ہے، ہاں اس میں
غالب اور میر ایسے بھی ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے" اس نوع کی تنقید کو تنقید نہیں
کہتے اسے جہالت کہتے ہیں یا بد دیانتی۔ اس میں شک نہیں کہ فحش اشعار اور قصے کہانیاں
آج کل بھی لکھی جاتی ہیں، پہلے بھی لکھی جاتی تھیں۔ (نئے ادب کے نقادوں نے ان
بزرگوں کی فحاشی کا عجیب جواز نکالا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کے لوگ فحش لکھتے تو
تھے لیکن اچھا سمجھ کر نہیں بُرا سمجھ کر لکھتے تھے۔ خوب بُرا سمجھتے تھے تو لکھتے ہی کیوں تھے؟
بہرحال ان کے بعد ان کے معاصرین کے بُرا سمجھنے سے ان کی تحریروں کی عریانی کم ہو جاتی
ہے۔ یہ انگیا اور محرم کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں) لیکن اور بے ترتیب نظم و نثر پہلے بھی
لکھی جاتی تھی اب بھی لکھی جاتی ہے۔ لیکن ایسی تحریریں نہ پرانے ادب کی نمائندہ
ہیں نہ نئے ادب کی، یوں کہنا چاہیئے کہ ادب میں ان کا شمار ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر
آج کل کے زمانے میں محض ایک اچھی نظم یا ایک ہی کامیاب افسانہ لکھا گیا ہے تو
نئے ادب کی نمائندہ وہی واحد نظم یا وہی واحد افسانہ ہے۔ اور نئے ادب کا جائزہ لیتے
وقت باقی تمام تحریروں کو خارج از بحث سمجھنا چاہیئے، شاید اس کے جواب میں کوئی
صاحب یہ کہیں کہ ادب کو مجموعی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے، اگر کسی ادبی دور میں اچھی

تحریریں کم ہیں اور بُری نسبتاً بہت زیادہ تو ہم اس دور کو کامیاب نہیں کہہ سکتے لیکن یہ قطعاً مہمل بات ہے، تنقید بنیا بن نہیں ہے کہ آپ ترازو لے کر بیٹھ جائیے اور یہ جانچنے کی کوشش کیجئے کہ اچھی تحریروں کا پلّہ بھاری ہے یا بُری تحریروں کا۔ اس ضابطہ سے آپ کسی نتیجہ پر پہنچ ہی نہیں سکتے مثلاً اگر آپ نے ایک پلڑے میں حافظ یا غالب کا دیوان ڈال دیا تو دوسرے پلڑے میں خواہ جہان بھر کی خرافات ڈال دیجئے پہلا پلڑا بھاری ہی رہے گا۔ دوسری بات ہے کہ جہاں تک بری تحریروں پر کوئی ڈیفنس آرڈر یا رول عائد نہیں ہوتا گھٹیا لکھنے والوں کی تعداد اور گھٹیا ادب کی مقدار اچھے لکھنے والوں اور اچھے ادب سے کئی گنا زیادہ ہی رہے گی۔ اور ہمیشہ رہی ہے۔ بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہ شاعروں کی زبان پر قفل نہیں ڈال سکے۔ تو آج کل جمہوریت کے دور میں اس فتنہ کی اصلاح کیا ہو گی۔ خاص طور سے جب بہت سے مصلحین اچھے اور بُرے میں تمیز بھی کر نہیں پاتے، مختصر یہ کہ اگر ہم نئے ادب کو سمجھنا چاہتے ہیں، اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس ادب میں امتیازی بات کیا ہے، اس میں کون سے نئے مضامین، نئے تجربات یا نئے اسالیب قابلِ اعتنا ہیں تو ہمیں اس ادب کے بہترین اور پاکیزہ ترین نمونوں پر توجہ دینی چاہیئے۔ خرافات کا کھوج لگاتے اور لغویات کا تجزیہ کرنے میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

یہ بات تو ہو گئی۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا چاہیئے تھا کہ نیا ادب کہتے کسے ہیں؟ اگر آجکل کے ادبی رسائل کو دیکھئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ نیا ادب کوئی ایسی چیز ہے جسے پچھلے چھ سات مہینوں میں کچھ علماء، حکماء اور نوابین نے مل کر دریافت کیا ہے۔ لیکن جہاں تک نئے ادب کی کوئی جامع اور واضح تعریف میری نظر سے گذری ایک کتاب "مداوا" دیکھنے میں آئی تھی جس سے یہ پتہ چلا کہ نئے ادب کے نمائندہ صرف پانچ شاعر ہیں۔ کسی وجہ سے وہ بھی سب کے سب پنجاب کے، پھر نگار کا نیا ادب نمبر دیکھا

تو یہ پانچ شاعر کہیں سمٹ کر دو تین رہ گئے، کہیں پھیل کر چھ سات ہو گئے۔ لیکن اس انتخاب کی وجہ اور نئے ادب کی تعریف پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی البتہ جناب رشید صدیقی صاحب نے اپنے ایک بسوط مقالے میں ترقی پسند ادب کی تعریف ضرور کی ہے۔ یعنی "پچھلے پچیس[۲۵] سال کا تجرباتی ادب" اس تعریف کو ترقی پسند ادب سے تو خیر کوئی واسطہ نہیں لیکن اگر ہم اسے نئے ادب کی تعریف مان لیں تو کیا نتائج نکلتے ہیں، اگر تجرباتی ادب کا تعلق اسالیب اور طریق اظہار سے ہے تو مولوی عظمت اللہ مرحوم حفیظ جالندھری اختر شیرانی اور فلمی گیت لکھنے والے سب نئے ادب میں شامل ہیں، اور جوش، مجاز جذبی، جاں نثار اختر وغیرہ سب نئے ادب سے خارج، آخر کیوں؟ اور پھر ان افسانہ نگاروں اور نقادوں کو کیا کیجئے گا، یہ تجرباتی ہیں کہ روایتی؟ ظاہر ہے کہ تنقید تبصرا اور آزاد افسانہ تو ابھی ایجاد ہوا نہیں اور نہ غالباً ہوگا، اس لیئے آج کل کے نثر نگار سب کے سب روایتی ہیں اور اس لیئے سب کے سب نئے ادب سے خارج، یا پھر یوں کہئے کہ تجرباتی کا اطلاق محض اسالیب اور طرائق اظہار پر نہیں ہوتا اس سے نئے مضامین اور نئے معانی بھی مراد لیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ اگر آپ پچیس سال ہی کی حد قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو نئے ادب میں اقبال اور ظفر علی خاں تو الگ فانی اور اصغر بھی شامل کرنے پڑیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ پہلے سے لکھ رہے تھے لیکن یہ شرط تو آپ نے نہیں لگائی تھی۔ اور اگر ہم نئے ادب کی تاریخ اقبال یا پریم چند سے شروع کرتے ہیں تو پھر یہیں رکنے کی کیا ضرورت ہے حالی اور مولوی نذیر احمد تک ہی کیوں نہ چلیئے، بہر حال پچھلے پچیس سال کا تجرباتی ادب نئے اور پرانے کو پہچاننے میں قطعاً آپ کی رہنمائی نہیں کرتا۔ صرف ایک صورت ابھی اور باقی ہے یعنی آپ موجودہ لکھنے والوں کو ان کی طبیعی یا ادبی عمر کے اعتبار سے تقسیم کر دیں مثلاً آپ یہ کہیں کہ نئے ادیب وہ ہیں جن کی

عمر یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو پینتیس ۳۵ برس سے کم تھی، یا نیا ادب وہ ہے جس کے مصنفین نے ۱۹۰۹ء کے بعد لکھا یا لکھنا شروع کیا لیکن اس سے بھی کیا فائدہ ہوگا بیسیوں نوجوان ایسے بھی ہیں جو دقیانوسی انداز کی غزل کے سوا کچھ لکھتے ہی نہیں نہ لکھنا جانتے ہیں اچھے لکھنے والوں میں بھی بہت سے ایسے ہیں جو کبھی پرانے انداز میں لکھتے ہیں کبھی نئے انداز میں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس ادیب کی عمر ابھی تیس پینتیس سے زائد نہیں یا جسے میدانِ ادب میں قدم رکھے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کوئی آخری اور قطعی رائے قائم ہی کیسے کر سکتے ہیں۔ آپ عالم الغیب تو ہیں نہیں کہ آپ ابھی سے کہہ سکیں کہ آج سے بیس برس بعد اس ادیب کی تصنیفات کا رنگ کیا ہوگا۔ جب اقبال یہ لکھ رہے تھے کہ ؎

نہ آنے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی　　مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

جب کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی دن جاوید نامہ اور بالِ جبریل بھی لکھ ڈالیں گے۔

تو مجھ سے پوچھئے تو یہ نئے اور پرانے کی بحث کچھ یوں ہی سی ہے دولت کی طرح ادب کا بہاؤ بھی مسلسل اور بے تکان ہوتا ہے جس طرح وقت کی گھنٹوں اور منٹوں میں تقسیم قطعاً فرضی اور غیر حقیقی ہے۔ اسی طرح نئے اور پرانے ادب کا تعین بھی سطحی اور غیر واقعی ہے۔ اگر ہم اپنی سہولت کے لئے کبھی ایسا کریں بھی تو ہمیں یہ بنیادی بات نہیں بھولنی چاہئیے، مگر آئیے سامنے رکھ کر ہم نئے ادب پر دوبارہ غور کریں تو ممکن ہے کسی مفید نتیجہ پر پہنچ سکیں یہ نتیجہ کیا ہے؟

جیسے زندگی کے حالات بدلتے ہیں ہماری ذہنی اور جذباتی کیفیتیں، ہمارے تجربات اور محسوسات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ ان خارجی اور داخلی تبدیلیوں کی رفتار کبھی تیز ہوتی ہے، کبھی مدھم، کبھی ان میں اچانک انقلاب بھی ہو جاتا ہے جن سے ان کی صورت تمہیدی طور پر مختلف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دس بیس برس

سے نبضِ ہستی کی رفتار کافی تیز ہے۔ دُنیا بھر میں نئی سیاسی اور جماعتی قوتیں اُبھر رہی ہیں
ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کا نقشہ بدلتا جا رہا ہے۔ بالکل نئے لکھنے والے
انہی نئی قوتوں کو سمجھنے اور ان سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ کوشش
ابھی تک ابتدائی مراحل میں ہے۔ جب تک زندگی میں ربط اور ہم آہنگی پیدا نہیں
ہوتی، ادب میں ربط اور ہم آہنگی پیدا ہونا مشکل ہے، نیا ادیب اپنے فن اور اپنی
زندگی میں اس ربط اور ہم آہنگی کی جستجو کر رہا ہے اس جستجو میں ایسے لمحات بھی آجاتے
ہیں جب اس کا دماغ یکایک اجاگر ہو جاتا ہے۔ نئے ادب کے اچھے نمونے ان لمحات
کی یادگار بھی ہیں اور نئے ادب کا جواز بھی؛ اس جستجو میں تاریکی اور بے راہ روی کے
لمحات بھی بہت ہیں۔ اور ان لمحات کی پیداوار بے سود بھی ہے بہ حیثیت بھی مجموعی
اعتبار سے نیا ادب ابھی پیدا ہی ہوا۔ ابھی اس عمارت کی بنیادیں صرف رکھی
جا رہی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کہ اس تعمیر میں خون پسینہ ایک
کرنے والے ان کاہل تماشائیوں سے کہیں زیادہ قابل قدر ہیں جنہیں الگ کھڑے
ہو کر آوازے کسنے کے سوا کام نہیں۔

نیا ادب میری نظر میں

کیفی دہلوی

دنیا ہمیشہ بدلی ہے اور بدلتی رہتی ہے، اگرچہ سورج اب بھی مشرق سے نکلتا ہے، اور مغرب میں جاکر چھپتا ہے، اگرچہ گنگا اب بھی پورب کو بہتی ہے، اور اٹک پچھم کا رخ پسند کرتا ہے، لیکن موسموں میں اگلے زمانے کے مقابلہ میں فرق آجانا بدیہی صداقت ہے، اسی طرح گنگا اور اٹک کی چال میں بھی بے شک فرق آگیا ہے اگرچہ ان کے رستے وہی پرانے ہیں۔

طبیعات کی طرح ذہنیات بھی تغیر پذیر ہیں اور اسی سے معاشرت میں انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ معاشرت ہی کو میں بنیاد قائم کرکے آج کے موضوع کی وضاحت کروں گا۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں جو انقلاب ہماری معاشرت اور اس کے تمام شعبوں میں ہوا ہے، تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی۔ اور ہر متمدن قوم کا ادب چونکہ معاشرت کا نہایت اہم شعبہ ہے ناممکن تھا کہ ان انقلابی عوارض سے متاثر نہ ہوتا، جو اب تک ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ماحول بنانے میں مصروف ہیں۔

تفصیل کی بحر طویل سے الگ ہوکر کسی شخص کو کیا اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ ہماری معاشرت اب وہ نہیں رہی جو پچاس ساٹھ برس پہلے تھی، جب امر واقعہ یہ ہے تو پھر ادب کے انقلاب کو گرم آنکھوں سے دیکھنے کے کیا معنی ہیں۔

قدامت پرست اور جدت پرست ہر زمانے میں ہوتے آئے ہیں۔ اور

ہمیشہ رہیں گے، یہ چاہنا کہ ایک خاص کام جس طرح آج ہو رہا ہے، ازل ہی اسی طرح ہوتا رہا ہے اور ابد تک اسی طرح ہوتے رہنا چاہیے، یہ شیخ چلی کی چاہ سے کم نہیں ایسا تو ہوا ہے، نہ ہو سکے گا۔

اگر آپ اُردو شاعری ہی پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ زبان اور محاورے سے قطع نظر، تخیّل کا طرزِ ادا، اور اسلوب اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے وہ نہ تھا جو ڈیڑھ دو سو برس پہلے تھا۔ شاہ گلشن نے ولی کو کیا مشورہ دیا؟ حاتم نے کیوں اپنے دیوان سے، دیوان زادہ اخذ کیا؟ ناسخ نے کیوں اپنے تخلص کو اسم بامسمیٰ ثابت کیا؟ غالب نے کیوں طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنے کی ٹھانی؟ اور داغ نے کیوں اعلان کیا۔ سے

کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو   جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

یہ واقعات جتنے زبان اور اسلوب سے متعلق ہیں قریباً اتنے ہی تخیّل شاعری سے متعلق ہیں۔ اگر اس میں کسی کو کلام ہو تو میں کہوں گا کہ میر اور سودا، مصحفی اور جرأت، منشی جوہر اور شیفتہ اور داغ و امیر کے دیوانوں کا موازنہ کر کے دیکھ لیں، ایک دوسرے سے سراسر میں جدا ہی ملے گا۔ اور انشا کی تو دنیائے شاعری ہی ادب کے سارے جہاں سے جداگانہ ہے۔ صاف الفاظ میں یہ کیوں نہ کہوں کہ اُردو ادب میں قدامت سے بغاوت ہوتی آئی ہے۔ پہلی بغاوت کے علمبردار شاہ گلشن اور شاہ حاتم تھے، دوسری بغاوت کا جھنڈا جرأت نے واقعہ پردازی اور معاملہ بندی کا نعرہ لگا کر بلند کیا۔ ناسخ کی بغاوت ادب کے فنّی لباس تک محدود رہی، لیکن اس کے مقلد یہاں تک آزادی پسند تھے کہ قافیہ کی بنا صرف صوت پر رکھنے لگے[1] داغ نے جرأت اور جوہر کے اجتہاد کو تازہ کیا، مگر اس کی بغاوت آئینی حدود کے اندر ہی رہی۔

---

[1] ملاحظہ ہو معائب سخن مولانا حسرت موہانی

سب سے بڑی بغاوت قدامت کے خلاف وہ ہے جو لکھنؤ میں ہنگامہ آرا ہوئی، یہ بیان ذرا تفصیل چاہتا ہے۔ جب ہم غزل کی چٹنی تیار کرنے بیٹھے تو بارہ مسالے جو ہم نے اس کے لئے ہمیں چھان کر رکھے ان میں ایک بھی ویسی نہ تھا معشوق کا تلوار گھماتے ہوئے مقتل میں آنا اور عاشقوں کی گردن اڑانا، خنجر اور کٹار کے وار کرنا، گھوڑے پر سوار ہو کر عاشق بسمل کو روندڈالنا، اور ایسی بیہودگیاں کل تک ہمارے مشاعروں میں داد لیتی تھیں۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا لکھنؤ کی اہم بغاوت کا جن کو یہ مردانہ عشق پسند نہ آیا، انہوں نے اس کا علاج یہ کیا کہ زنانہ پوشاک اور دوسرے جنسی لوازمات کا تذکرہ غزل میں داخل کیا، اس طرح انہوں نے ایک بہت بڑا عیب ہماری شاعری کا دور کیا، لیکن ان کا فعل اصلاحی تھا، انقلابی نہ تھا، کاش وہ فعل کے صیغوں کی تذکیر کو بھی بدل دیتے، مگر لکھنؤ کے دل میں اپنے استادوں کی عزت تھی اس لئے رک گئے اکثر کم بین نقاد لکھنؤ اسکول کی شاعری کو انگیا کرتی اور کنگھی چوٹی کی شاعری کے طنز آمیز کلمے سے یاد کرتے ہیں لکھنؤ کی یہ دفاعی کوشش بہت بدنام ہوئی، افسوس ہے کہ کسی نے اس بغاوت کی علت غائی پر نظر نہ ڈالی، خیر اس بدعنوانی کو میں ایک اور جگہ واضح کر چکا ہوں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اردو شاعری میں ہمیشہ انقلاب آتے رہے ہیں اور بغاوتیں ہوتی رہی ہیں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس حقیقت میں آپ مجھ سے متفق ہیں۔

ایک اور جدید بغاوت کا ذکر رہا جاتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوئی اور جس کے علم کی پرچم کشائی محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں کی اور پھر حالی نے اسے آ سنبھالا۔ یہ بغاوت اگلی تمام بغاوتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر نتیجہ خیز

اور عالمگیر تھی، قدامت پرستی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، جو بن پڑا کیا، اور جو نہ کرنا تھا وہ بھی کیا لیکن اسے ہار ہی ماننی پڑی۔ کیونکہ وہ بغاوت حقیقی اور اصولی تھی۔ اس کے علمبردار حقائق اور واقعات سے متاثر تھے، اس کی تحریک میں تشخیص یا تخریب نہیں بلکہ اصلاح اور تجدید کارفرما تھی۔ آزاد کا اجتہاد کسی نظریئے پر مبنی نہ تھا۔ حالی کی معرکہ آرائی ذاتی پسند سے ملوث نہ تھی، ان کا فعل تعمیری بلکہ تو تعمیری تھا، انکے ذہن سے شک اور تذبذب منزلوں دور تھا۔

آزاد کو شکایت تھی کہ وطن کے وہ نوجوان جنہوں نے مغربی علم و ادب کی روشنی پائی ہے۔ کیوں اردو سے بے پروا ہیں۔ وہ ان کے التفات کی محتاج ہے سر عبدالقادر کے ابتدائی زمانے تک قوم کی انگریزی خواں جماعت اسی طرح اردو سے بے رخ ہے۔ اب اس کا ردِ عمل ہوا اور اس شدت سے ہوا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔

پچھلے پچیس تیس برس میں ہماری معاشرت میں جو انقلاب ہوا، وہ اس انقلاب سے بہت شدید اور ہمہ گیر ہے جو اس سے پہلے کے بیس پچیس برسوں میں ہوا تھا۔ یہ منتہا ہے اس انقلاب کا جو ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا تھا۔ اب ہمارا ہر فصل حریت تخیل کے تابع ہے، اب سند پر استدلال کو ترجیح دی جاتی ہے سمجھئے کہ ہیں نے سب کچھ کہہ دیا۔۔۔۔۔۔ کہ اب پبلک جلسے اس خطابی کلام سے شروع ہوتے ہیں۔

"محترم خواتین اور معزز حاضرین"

بس اس میں سب کچھ آگیا۔ اب تفصیل طول فضول ہے۔

انصرام اور اہتمام کے ساتھ حریت تخیل کا جو سبق آریہ سماج اور علی گڑھ کی تحریک نے پڑھایا تھا وہ رنگ لایا اور اب آزادی کا کلمہ ہر شخص کے ذہن میں

گونجنے لگا۔

اقبال نے کہا ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

قاعدہ ہے کہ ذہن جب ایک قید سے آزاد ہو جائے تو اسے دوسری قیدیں بھی دوبھر محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ ان کو بھی توڑ ڈالنے میں کسر نہیں کرتا۔ وہ تحریکیں جن کا آگے ذکر ہوا اپنی نوعیت میں ملّی، رواجی یا نیم مذہبی تھیں لیکن ان کا اثر انداز ہونا تھا کہ قوم کی ذہنیت کا رجحان عام آزادی کی طرف ہو گیا۔ اقتصادی کشمکش اور سیاسی حادثوں نے اسے اور بڑھاوا دیا نتیجے پر تاویل غیر ضروری ہے۔ پھر ادب جو زندگی کا ایک اہم شعبہ اور معاشرت کا آئینہ بردار ہے کیونکر اس انقلاب آفریں عہد کے تاثرات سے محفوظ رہتا۔

اس ضمن میں جو کچھ اب تک عرض کیا گیا وہ مبادیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل تنقیح سے اب بحث ہو گی۔

آپ کو یاد ہو گا، قدیم شاعری میں عموماً جنسی قباحت اور رکاکت کا عیب تھا جس کے دور کرنے میں لکھنؤ کی کوشش شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی، وہ قباحت اب رفع ہونے کو ہے۔ آج کل آرٹسٹ کا ایمان یہ ہے کہ کوئی آرٹ جنسی جذبے کی صلاحیت کے بغیر لطافت نہیں پیدا کر سکتا۔ داخلیت اور خارجیت یا خارجی داخلیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اب واقعیت کا راج ہے، واقعہ نگاری اور جذبات کی عکاسی پہلے بھی تھی۔ لیکن وہ معاملہ بندی کے پنجرے میں بند تھی، مزدور، کسان، سرمایہ دار، آمریت اور اشتراکیت، وطنیت اور جمہوریت وہ موضوع ہیں جن پر ہمارے نوجوان شاعر آج کل طبع آزمائی کرتے ہیں، یہ موضوع ہم بوڑھے آدمیوں کو بھلے نہیں معلوم ہوتے اور ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ "ہائے ادب اور شاعری کا

خونِ ناحق ہو رہا ہے" جب ادب لطیف، ترقی پسند اور نیا ادب کا نام سنتے ہیں تو ہمارے غصّے کی حد نہیں رہتی فن کے قواعد سے انحراف بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا اور ہم جابرانہ تنقید میں دل کا بخار نکالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ منحرفانِ ادب پر بے پناہ وار کیا بزرگانِ ادب کا یہ غصّہ اور یہ سلوک نہ زیبا ہے اور نہ قرینِ مصلحت ہے۔

عمرانیات میں یہ امر مسلّم ہے کہ جماعت کا ایک حصہ جب کسی معاملے میں سختی اور عصبیت سے ایک حد پر ہو، تو مختلف رائے والا حصّہ دوسری حد پر مستحکم ہو جاتا ہے اور ان دونوں حصوں کے درمیان ایک ناخوش گوار محاذ قایم ہو جاتا ہے۔ جس کے شاخسانے دور تک پہنچتے ہیں، شاہ نظر کے حق میں ثقاتِ ادب کا جو سلوک ہوا اور جو اس کا ردِّ عمل ہو رہا ہے وہ ہمارے ادب کی تاریخ کا ممتاز حصّہ ہے خواجہ حافظ کا شعر ہے۔ ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

اس پیار کے لہجے میں انہیں خطاب کرنا چاہئے کہ بھیّا! بیشک تم ہی قوم کے ادب کا مستقبل ہو، ہم جو کچھ بھی ہیں اب ادبی پنشنر کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر عزیزو ہم نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے، ہمارے تجربے تم کو فائدہ پہنچائیں گے، ان سے سبق لو موجودہ زمانے کے رنگ میں دل آویزی پیدا کر کے اس کو اپناؤ، اور آئندہ کی ضرورتوں کا اندازہ کر کے ابھی سے ان کا بندوبست کرو مگر اس کا لحاظ رکھو کہ قوم کے اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑے اور فن سرے سے برباد نہ ہو جائے۔

اگر اس لہجے اور طرز میں قوم کے نوجوان ادیبوں کو سمجھایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اکارت نہ جائے گا مجھے امید ہے کہ ہمارے جوان دوست اپنی اہمیت کے

ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داری کو بھی محسوس کرتے ہیں اور یہ کہ عہدِ حاضر خواہ کیسے ہی زبردست رجحانات مہیا کرے وہ جان بوجھ کر کوئی ایسا کام نہ کر گذریں گے کسی ایسے نظریئے پر لائحہ عمل کی بنیاد قائم نہیں کریں گے جس کے خراب نتیجے نکلیں۔

بات جو یہاں تک پہنچ گئی تو میں اپنے جوان دوستوں سے چند دل کی باتیں کہہ دینا چاہتا ہوں، لاگ لپیٹ واہیات ہے۔ میں آج معاملہ صاف کئے دیتا ہوں جب آج کل کی برہنہ واقعیت اور عریاں نویسی کی شکایت کی جاتی ہے تو آپ کا جواب یہی ہوتا ہے تاکہ جرأت کی معاملہ بندی بھول گئے واسوخت امانت کے فلاں بند تو ذرا بآوازِ بلند سنائیے، داغ کا فلاں شعر تو ذرا اپنے نورِ چشم کو واضح کرکے سمجھائیے۔ وغیرہ

جواب میں گذارش ہے کہ ان بے اعتدالیوں کو کوئی پسند نہیں کرتا عیب عیب ہی رہے گا۔ خواہ وہ کسی ذات سے سرزد ہو۔ لیکن آپ کیسے دانشمند ہیں کہ عیب کو عیب جانتے ہیں مگر اس کی پیروی کئے جاتے ہیں؟ ایک بات آپ کو ہرگز نہ بھولنی چاہیئے کہ وہ زمانہ اور تھا، اب اور زمانہ ہے، جب یہ چیزیں بیٹھکوں اور دیوان خانوں تک محدود رہتی تھیں، جب ہماری صنفِ لطیف کو اس خرافات کی کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی؟ عورتوں میں تعلیم اور آزادی جواب ہے، پہلے کہیں تھی؟ اب گھر کا زنانہ اور مردانہ ایک ہے، یعنی سیٹنگ یا ڈرائنگ روم، آج کئی رسالوں کی ادارت عورتوں کے ہاتھ میں ہے، عورتیں غیر ملکوں میں پبلک حیثیت سے یا سیاست اور تعلیم کے لئے جاتی ہیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ لڑکیوں کی اچھی تعلیم آج کل اچھی شادی کا پاسپورٹ ہے۔ ایک بل کے سلسلے میں مرکزی اسمبلی نامکمل سمجھی گئی، جب تک ان کے ممبروں میں ایک خاتون کا اضافہ نہ کیا گیا، ان حالات اور اس ماحول کے لحاظ سے آپ کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نظم ہو یا نثر تصنیف و تالیف سے متعلق آپ نوجوانوں

کی ذمہ داریاں بہت زیادہ اور اہم ہیں، مغرب کی تہذیب اور تمدن کے محاسن سے
ہم سب کو استفادہ کرنا چاہیئے ان کو اپنی معاشرت میں سمونا ضروری اور مفید ہے
لیکن مغرب کی کورانہ تقلید ہماری ذہنیت کو غلامانہ بنا دے گی، بہ قول شاعر
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لینا دانشمندی ہے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے، شاعر اور منشی کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی
ہیں، یہ نہ کہیئے کہ فصاحت کے قدیم ضابطے اور فن کے تعزیری آئین سے آزاد
ہو کر اب ہمیں کیا ستانا اور کس کا اندیشہ ہے، حضرت یہ زمانہ چھوٹ اور کھلار
کھیلنے کا نہیں۔ آپ کو اپنی تحویل کی خبر ہے؟ قوم کے انفرادی اور اجتماعی اخلاق
جماعت کا ناموس، قوم کی نسائیت کے ذہن کی پاکیزگی، نوجوانوں کے تخیل کی
لطافت، وطن کی تہذیب اور کلچر کی حفاظت، اس قسم کی اور بھی ذمہ داریاں ہیں
جو آپ کے سر ہیں، آپ کو ماضی سے سبق لینا ہے، حال کو جانچنا ہے اور مستقبل کا انتظام
کرنا ہے یہ فرائض ہیں جو آپ کو سر انجام کرنے ہیں اور ادائے فرض کے لئے جو سامان آپ کے
پاس ہے وہ ہے، زبان اور ولولۂ صادق، آپ جانتے ہیں جذبہ ذہن کا وہ داخلی
جوہر ہے جو تزکیۂ نفس اور معصوم خود فہمی سے پیدا ہوتا ہے، خارجی تقلید سے نہیں،
جنگ عظیم کے بعد جو انقلاب دنیا بھر کی زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا ہوا وہ ہماری
آنکھوں کے سامنے ہے مگر ہماری حالت کچھ انوکھی سی ہے ع پراگندہ شدے بود نارسا اس
سیاسیات میرا میدان نہیں مگر یہ راز فاش ہے کہ ہندوستان کی خود مختاری کا مسئلہ اس
کی رعایا کے دو بڑے حصوں کے اتحاد اور باہمی سمجھوتے پر آ کر اڑا ہوا ہے، ہمارے
شاعر اور مصنف اس اختلاف کی جمود کے دور کرنے میں کیا کر رہے ہیں۔

مزدور ہمارا داہنا ہاتھ ہے۔ اور کسان ہمارا مجازی رازق ہے، انکی ذات
اس میں شک نہیں اصلاح و بہبودی کی محتاج ہے، آپ نے کبھی کارخانوں میں جا کر

اس امر کے دریافت کرنے کی زحمت گوارا کی کہ فیکٹری اور ملوں میں وہ کیا کام کرتے ہیں، اور اس کے باہر کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں کبھی گاؤں میں جا کر دیکھا کہ کسان اپنے کھیت کی پیداوار سے کیا اور کیوں کر سرکاری سکہ وصول کرتا ہے اور اُسے کس طرح صرف میں لاتا ہے ایک چمکتی ہوئی نظم یا چٹختا ہوا افسانہ لکھ دینے سے کچھ کام نہیں بن سکتا برسوں سے سن رہے ہیں کہ ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

مگر کیا ہوا؟ نہ جنبید گُل محمد، ہماری دُنیا وہیں ہے۔ جہاں پہلے تھی۔ ہماری معاشرت کی خاص صورتیں ہیں ہم جن مخصوص عوارض میں جوں توں زندگی کے دن بھر رہے ہیں وہ کرۂ زمیں پر اور کہیں نہیں پائے جاتے، اس لئے مغرب کی اندھی تقلید قبلِ جنگِ عظیم تعلق رکھتی ہو۔ یا اس کے بعد سے ہمیں راس نہیں آسکتی، اس ضمن میں اور کچھ آگے عرض کیا جائے گا۔ صرف دو چار باتیں کہہ کر میں اس تنقیح پر بحث ختم کئے دیتا ہوں، رومان اور جذباتی نظموں کا آج کل بہت زور ہے، افسوس ہے کہ اس میں ندرت کا رنگ نظر نہیں آتا۔ چند حضرات ہیں جو اس نوعیت کی نظمیں کامیاب پیش کرتے ہیں۔ یہ نظمیں جیسی کچھ بھی ہوتی ہیں ان کا پس منظر کلاسیکل یا متغزلانہ ہوتا ہے۔ جو اُن سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں رکاکت اور ابتذال آجاتا ہے۔ ان شاعروں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ انہیں یاد رکھنا چاہئے حریتِ تخیل، عصمتِ تخیل سے الگ ہو کر قومی ذہنیت کے حق میں زہرِ قاتل بن جاتی ہے۔ ہمارے جوان شاعروں سے یہ کوئی نہیں کہتا کہ دلائل الخیرات اور جوگ

بشَشت سے اپنی نظموں کے موضوع اخذ کیا کریں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ وہ اپنی فطری شبابیت کو مصنوعی فرتوتیت سے بدل ڈالیں۔ جب کہ بوڑھوں میں تزکیہ نفس عصمت بی بی از بے چادری سے زیادہ نہیں۔ جوانوں میں عصمت تخیل اور تزکیۂ نفس وہ نعمت سبحانی ہے کہ جس کے بغیر کوئی قوم پروان نہیں چڑھ سکتی۔

جدید ادب نے کئی ایسی نفیس اور وقیع چیزیں پیدا کی ہیں۔ جو قوم کی زبان کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اور ہم خوش ہیں کہ وہ ہماری آنکھوں کی نور افروز ہوئیں۔ مگر عموماً رومان اور جذباتی کلام ایسا نکل رہا ہے کہ اسے دیکھ کر چپ ہی رہنا پڑتا ہے۔

ہمارا عنوان "نیا ادب میری نظر میں" اب تک جو کچھ کہا گیا وہ زیادہ تر نظم سے متعلق ہے۔ اگرچہ اصولاً نثر پر بھی اسی طرح عاید ہوتا ہے لیکن اب چند باتیں خصوصی طور پر نثر جدید سے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ نثر کا میدان نظم سے کچھ زیادہ ہی وسیع ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے نثر کے صرف دو شعبوں پر نظر ڈالی جائے گی۔ یعنی افسانچہ اور تبصرہ۔

افسانچہ اپنے خارجی رنگ روپ کے ساتھ اُردو میں نئی چیز ہے۔ اور جس سرعت سے اُس نے ترقی کی اور عروج پکڑا نہایت حیرت انگیز ہے۔ خیر آج کل کے افسانچے ایک وہمی واقعیت اور پھوہڑ سادگی کا شکار ہیں۔ اس کو کوئی صاحب کلیہ نہ سمجھ بیٹھیں۔ میں عام حالت کا ذکر کر رہا ہوں۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ بعض باتیں فطرت پر اور وقت پر چھوڑ دی جاتی تھیں۔ ان کی ماہیت یا ہدۂ بلکہ مشاہدہ بالواسطہ تک محدود رہتی تھی۔ رات کو گھر میں بلّی کے بچے ہوئے صبح کو گھر کا سات برس کا لڑکا پوچھتا ہے یہ کہاں سے آئے۔ کہہ دیا جاتا ہے تمہاری بلّی کے ہوئے ہیں۔ معاملہ وہیں ختم

ہو جاتا ہے، وہی لڑکا بڑا ہو کر اور لکھ پڑھ کر بائی اولوجی کا پروفیسر اور ایک درجن اولاد کا والد بزرگوار ہو جاتا ہے، یہ کہاوت سنی ہوگی کہ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے، یہی حال جنسی تشریح اور جنسی نفسیات کا ہے، واقعیت کی دھن جذبات عالیہ اور اخلاق حسنہ سے گزر کر ہمارے افسانچوں کے بڑے حصہ کو زندہ جسم پر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بنا دیتی ہے، یہ عیب اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، لوگ اور ملک کا قانون برہنہ عکاسی اور عریاں نویسی سے تنگ آگئے ہیں۔ یہ قباحت متقدمین کو کھٹکتی تھی، چنانچہ صاحب "اخلاق جلالی" نے تاکید کی۔

"الفاظ غریبہ و کنایات بعیدہ استعمال نہ کند، و از فحش و شتم احتراز نماید و اگر احتیاج بہ تعبیر از امرے فاحش افتد بہ تعریض و کنایہ اکتفا کند۔"

میں پھر کہتا ہوں کہ ہمارے تمام افسانچے اور افسانے اس ضمن میں نہیں آتے بلکہ تردید کے خوف کے بغیر میں یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ ہمارا افسانوی خزانہ ملک کی ترقی نہیں تو اکثر و بیشتر زبانوں کے ذخیروں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، یہ رجحان کہیں تبدیل کر وبائی صورت نہ اختیار کر لے اس لئے اس کی روک تھام لازمی ہے۔ مگر یہ روک تھام اگر کارگر ہو سکتی ہے تو خود افسانہ نگاروں کے ہاتھ سے، اس کا ہر حالت میں خیال رکھنا چاہئے کہ

"مغرب زدگی اس کو نہ کر دے کہیں برباد — وہ جوہر جنسی کہ لقب جس کا حیا ہے"

معلوم رہے کہ اب اخباروں میں جو شادی کے اشتہار نکلتے ہیں۔ اُن میں دلہن کے لئے "ماڈریٹ ایجوکیشن" اور "ہاؤس ہولڈ ورک" کی شرط بھی وارد ہونے لگی ہے۔ آپ خود سمجھتے ہیں کن صورتوں نے یہ شرطیں رائج کیں۔

جاتا ہے، غزل ہو یا نظم، افسانہ ہو یا افسانچہ غرض کہ جو تحریر ہو، باپ۔ جواں بیٹی یا بیٹے کے سامنے بلند آواز سے اور ماتھے پر رومال پھیرے بغیر نہیں سنائی جا سکتی، وہ دیا سلائی کے حوالے کر دینے کے قابل ہے۔

ایک سوال رہ جاتا ہے اس سے پہلے کہ میں اس مد کو ختم کروں، وہ ہے قومی روایات کی بابت۔ معلوم رہے کہ اعتبارات اور رجحانات سے قطع نظر ایک قوم اپنی روایات ہی سے زندہ رہتی ہے، روایات ہی ایک قوم کے احساسات اور جذبات کی تشکیل کرتی ہیں۔ روایات ہی نسل انسانی کو لافانی وحدت عطا کرتی ہیں اور یہی اس کی بقا کا سبب ہوتی ہیں۔ ان کی حفاظت ہر محب قوم کا مذہب ہونا چاہیے۔

لغت میں "تبصرہ" کے معنے ہیں "سمجھانا" "سجھانا" دو لفظ اور ہیں جو تبصرے کے ہم معنی الفاظ کی طور پر استعمال کیے جاتے ہیں یعنی "نظر" (سوچ) اور "نقد" بمعنی پرکھ" انتقاد اور تنقید۔ نقد سے مشتق ہیں، تبصرے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ مصنف کو سمجھایا اور سجھایا جائے کہ تمہاری تصنیف میں فلاں فلاں نقائص ہیں اور فلاں فلاں محاسن ہیں اور اس پرکھ کی توجیہہ یہ ہے۔ اگر تبصرے کے اصول کے مطابق تبصرہ ہو، تو مصنف اس سے بے انتہا فائدہ اٹھا سکتا ہے، لارڈ ٹینی سن نے تبصرہ سے جو فائدہ اٹھایا، اس کا تذکرہ انگریزی ادب کی تاریخ کا ایک مستند باب ہے۔ شرر مرحوم کی ایک کتاب کا نام تھا "بدر النسا، اور اس کی مصیبت" لیکن تبصرے کے بعد اس کے نام میں سے کلمہ عطف حذف ہو گیا۔ اگر سمجھانے اور سجھانے کی اہلیت مبصر میں اور سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت مصنف میں ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ادب تبصرے کے بغیر صحیح ترقی نہیں کر سکتا۔ لیکن جب ہم تبصرے کو مناظرہ اور مکابرہ بنا دیں۔ تو اس کی افادیت مفقود ہو جاتی ہے۔

سب مانتے ہیں کہ اردو ادب میں تبصرہ کے شعبہ نے جو ترقی کی ہے بے نظیر

ہے، اس کی نظیر ملک کی اور زبانوں میں نہیں ملتی۔ جنگ کے بعد کی افراتفری کی طرح نقصیدے پر بھی چھا گئی۔ اب ہم اپنی تصنیفوں کی جانچ مغربی پیمانے سے کرتے ہیں، معاشرت کے رنگ اور ماحول سے آنکھیں بند کرکے ان قاعدوں کو سامنے رکھ کر تنقید کرتے ہیں جو مغرب کے حضرات اپنی شاعری کے لئے باندھتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ قاعدے سب کے سب اعتنا کے ناقابل ہیں لیکن کچھ مدت سے ہماری ذہنیت خذ ما صفا کے سنہری اصول سے منحرف اور اندھی تقلید کی عادی ہو گئی ہے، جب انگلستان کے ایک حال کے نقاد نے یہ کہنے میں تکلف نہیں کیا کہ بلش انگریزی بھول گیا تھا۔ تو ہمارے ایک نقاد نے بھی یہ کہنے میں تامل نہ کیا کہ "میر کے کلام کا بہت سا حصہ ایسا ہے کہ اسے سر بازار زد و کوب کیا جائے۔" تنقید کی تقلید تنقید حیثیت ہی پیدا کر سکتی ہے وہ لیوس ہوں یا رچرڈس، ایلیٹ ہو یا کوئی، ہم کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ہماری معاشرت اور ادب کا ماحول کس درجے تک ان کے اصول انتقاد سے مستحسن اثر لے سکتا ہے، اخذ اور تقلید میں جو فرق ہے کسی تاویل و تعبیر کا محتاج نہیں، اب میں ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

معرکۂ حیات مستقل اور مسلسل مساعی کا طالب ہے اس کا مطالبہ ہے "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اگر آپ ماحول کو اپنے مزاج کے مطابق نہیں بنا سکتے تو خود کو اس کے مطابق بنائیے، جب ماحول اور عوارض میں تغیر واقع ہو اور اس میں اور آپ میں موافقت کی اور امتزاج کی صورت نکل آئے تو اسے معاشرت کی کامیابی اور ترقی سمجھنا چاہیے، جب تغیر کی رفتار اتنی تیز و تند اور طوفانی ہو کہ موافقت اور امتزاج ناممکن ہو جائے تو معاشری موت اس کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، جب تغیر بیرونی اسباب کا نتیجہ ہو تو کسی احتیاط کو غیر معتدل نہیں کہہ سکتے۔

نیا ادب میری نظر میں

ماہر القادری

کسی مسئلہ سے اختلاف و اتفاق کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، تمدن و تہذیب کے ہر دور میں مخالف اور موافق مباحث کی کشمکش نظر آتی ہے، فلسفہ ہو یا تاریخ، مذہب ہو یا ادب، غرض فکر و عمل کا کوئی شعبہ اختلافات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ کسی انسان یا جماعت کو غلطی پر دیکھ کر اسے ٹوکا جائے کسی غلطی، گمراہی اور بے راہ روی کو دیکھ کر اس خیال سے خاموش رہنا کہ اس بے راہ روی میں بظاہر بات نہیں معلوم ہوتی مستقبل میں یہ اپنی موت آپ مر جائے گی یا کم سے کم اس غلط تجربے کے نتائج کے ظہور میں آنے تک کوئی تنقید نہ کی جائے۔ بہت بڑا اور خطرناک فریب نفس اور تحمل و رواداری کا انتہائی غلط استعمال ہے۔

اس دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ جو سب سے بڑی بھلائی کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک دوسرے کی غلطیوں پر احتساب کیا جائے۔ غلطی کے تمام پہلو اور بے راہ روی کے تمام گوشے بے نقاب کئے جائیں۔ بے راہ روی اور گمراہی کے خلاف آواز اٹھانا سب سے بڑا جہاد اور انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ رائے کا اختلاف اور غلطی پر احتساب و تنقید نہ تو تنگ نظری ہے اور نہ قدامت پرستی۔ جو لوگ اختلافات کو برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے اُن کو رزمگاہِ حیات کے حدود سے نکل جانا چاہیئے۔

جدید گمراہ کن شعر و ادب کے خلاف بھی بہت غور و خوض کے بعد انتہائی

متانت اور سنجیدگی کے ساتھ آواز بلند کی گئی ۔ جس کی بازگشت ہندوستان کے
ہر گوشہ سے سنائی دی ۔ اس آواز نے ارباب نظر کی توجہات کو چونکا دیا سوتے
ہوئے جاگ اٹھے، جاگنے والے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اور چلنے والے احتیاط کے
ساتھ قدم اٹھانے لگے ۔ مخالفین نے دلائل و براہین سے جواب دینے کی بجائے کہنا
شروع کیا کہ یہ تحریک مذہبی ہے ۔ اس کے علمبردار قدامت پرست اور تنگ نظر
ہیں ۔ سماج اور زندگی کے جدید مسائل کی ان کو خبر نہیں ۔ غرض ہر وہ تہمت اور الزام
جو تراشا جا سکتا تھا وہ تراشا گیا ۔ اور لطف تو یہ ہے کہ اتنا سب کچھ کہنے کے بعد
عالی ظرفی وسعت نظر اور رواداری کا دعویٰ اپنی جگہ قائم ہے ۔

اس "ترقی زدہ جماعت" کے ایک گروہ نے تو تہمت و دشنام طرازی کا
طریقہ اختیار کیا جس کو وہ شاید "ترکی بہ ترکی جواب" سمجھ کر خوش اور مطمئن ہے
اور دوسرا گروہ "ترقی پسند ادب" پر لگائے ہوئے تمام الزامات سے برأت
ظاہر کرتے ہوئے "ترقی پسند ادب" کی تعریف میں اجمال و ابہام کی پیچیدگیوں اور
زاکتوں سے کام لیتا ہے ۔ اس جماعت کے جس رکن سے دریافت کیجئے وہ "ترقی پسند
ادب" کی نئی تعریف بیان کرے گا ۔ اور اگر افراد کا نام لے کر پوچھئے تو ہر شخص دوسرے
شخص کے متعلق کہے گا کہ "وہ ـــ اجی وہ ـــ تو ترقی پسند شاعر اور ادیب
ہو ہی نہیں سکتے" دنیا کی بہت ہی مشہور اور پر اسرار "باطنی تحریک" کے متعلق کتابوں
میں پڑھا ہے کہ اس کا ہر رکن دوسروں کے سامنے "باطنی تحریک" کو برا بھلا کہتا
اور ایک باطنی دوسرے باطنی سے بیزاری اور اجنبیت کا اظہار اور باطنی تحریک
کی عجیب و غریب تعریف بیان کرتا ۔ مگر آپس میں سب ملے ہوئے تھے ، مجھے تو ان
"ترقی زدہ افراد" میں بھی یہی روح کارفرما نظر آتی ہے کہ غیروں کے روبرو ایک
دوسرے سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں مگر سب کا نقطۂ خیال ایک ہی ہے ۔

میں اس دوسری جماعت کے بعض افراد کے علمی و ادبی وقار کا معترف ہوں اور ان کے اس خیال کے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ "ترقی پسند ادب" وہ نہیں ہے جو اس "نام" سے غلط طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس جماعت کے افراد اپنے نقطۂ خیال کو واضح کیوں نہیں کرتے، صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ "حقیقی ترقی پسندوں" کی طرف سے کئی سال قبل ایک "مینی فیسٹو" شائع کر دیا گیا ہے اُسے پڑھ لیا جائے حقیقت حال واضح ہو جائے گی۔ اس زمانہ میں جب کہ یہ موضوع شدت کے ساتھ بحث میں آ رہا ہے "حقیقی ترقی پسندوں" کو "جعلی ترقی پسندوں" کے طرز عمل سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے اپنے نقطۂ خیال کا اظہار کرنا تھا، مجھ سے ذاتی طور پر بعض "ترقی پسند" حضرات نے فرمایا کہ اردو اصلاح ادب کانفرنس بمبئی نے جن ادبی گمراہیوں پر احتساب کیا ہے، وہ یقیناً احتساب و اصلاح کی سزاوار ہیں اُن کو صرف یہ شکایت ہے کہ اس قسم کے لغو لٹریچر کو "ترقی پسند ادب" کہنا نہ چاہیے تھا کہ اس سے لوگوں کو غلط فہمی ہوگی اور وہ "حقیقی ترقی پسند ادب" کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں گے، ان حضرات کا ارشاد سر آنکھوں پر، یہ بات اپنی جگہ معقول ہے اور معقول بات کو الجھا دینے میں ڈالنا سب سے بڑی نامعقولیت ہے، مگر میری گزارش یہ ہے کہ اردو اصلاح ادب کانفرنس بمبئی کی تجاویز سے جب اُن کو اتفاق تھا اور ان کے بقول اس کانفرنس نے خود اُن کے خیالات کی تائید کی تو پھر کانفرنس کے مقاصد و تجاویز کی تائید کرنی تھی۔ ان حضرات کے پاس رسالے اور اخبار بھی ہیں۔ اور ان کی بات کا لوگ وزن بھی محسوس کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ روش قدرے مخالفانہ ہی رہی۔ ایسی حالت میں ہم مجبور ہیں کہ جو لوگ بھی ترقی پسند یا جدید ادب کے نام سے لٹریچر پیش کر رہے ہیں اُن پر "نئے ادب" اور "ترقی پسندی" کے عنوان ہی سے تنقید کی جائے اگر

حضرات کا دامن ان الزامات سے پاک ہے اُن کو نا خوش اور مکدر نہ ہونا چاہیئے، یا پھر وہ اپنی پوزیشن کو کھلے لفظوں میں واضح کر دیں کہ غلط فہمیوں کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ رہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد سب سے پہلے اس غلط فہمی کا اظہار کرنا ضروری ہے کہ "گذشتہ ادب" یا "ترقی پسند ادب" کی بے راہ رویوں کے خلاف جو کچھ کہا جا رہا ہے اُس کی تہ میں کوئی مذہبی جذبہ کارفرما نہیں ہے یہ خالص علمی اور ادبی تجزیہ ہے، ظاہر ہے کہ "بلیک ورس" کی اسلام کے کسی قانون یا اصول پر زد نہیں پڑتی، اور نہ غزل کسی مذہبی اصول کا جز ہے۔ اس لئے بلینک ورس کی مخالفت اور غزل کی حمایت کوئی مذہبی اور اسلامی کام نہیں ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "ترقی پسند ادب" میں لفظ و زبان کا انتہائی غلط استعمال ہوتا ہے، نظموں میں آہنگ اور تسلسل نہیں پایا جاتا تو اُس وقت بھی کوئی مذہبی تصور ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا کہ لٹریچر کی فنی غلطیوں کی گرفت بھی مذہبی فریضہ نہیں ہے۔ اب رہی عریانیت اور فحش نگاری سو اس کو عام اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ناپسندیدہ اور غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ دوسری بات ہے کہ مذہب اور عام اخلاقی نقطۂ نگاہ اس مرکز پر متفق ہو جاتے ہیں۔ اس اتفاق خیال کی نوعیت ایسی ہے جیسے ایک خدا پرست اور دہریہ دونوں ظلم و ناانصافی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ خدا اور مذہب کی مخالفت میں جو توہین آمیز لٹریچر آ رہا ہے اُس کے خلاف آواز بلند کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جو خدا اور مذہب پر یقین رکھتے ہیں اس قسم کے توہین آمیز لٹریچر کو پڑھ کر زبان و ادب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور خود "ترقی پسندی" کے مقصد کو اس طرزِ عمل سے صدمہ پہنچے گا۔ ایک وہ شخص

جو سرمایہ داری کی مخالفت اور مزدور کی حمایت کرتا ہے جب خدا اور مذہب کو بھی گالیاں دے گا تو وہ شخص جو خدا اور مذہب کو مانتا ہے اس کے پہلے صفحہ جیسے زیادہ متاثر نہیں ہو سکتا کہ اس کی عقیدت کو مجروح کیا جا چکا ہے۔ اور زخم خوردہ زخم پہنچانے والے کے اچھے اور صحیح مشورے کو بھی آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ پھر کبھی خوف اور جھجک کے بغیر صفائی کے ساتھ یہ کہنے کے لئے بھی تیار رہو کہ دنیا میں ہر شخص کو اپنے معتقدات کی توہین و تکذیب کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے تو ہم اہل مذہب بھی خدا اور مذہب کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ ایسے دل آزار لٹریچر سے اردو زبان کے پاکیزہ دامن کو داغدار کیا جائے۔ اردو جس ملک میں بولی اور پڑھی جاتی ہے وہاں ہر مذہب کے خدا کے ماننے والے پائے جاتے ہیں، شعر و ادب کو عام دل آزاری کی سطح سے بلند ہونا چاہیئے۔ اہل نظر کو انکار اور توہین کے فرق سے واقف ہونا ضروری ہے۔

اردو زبان میں ادبی بے راہ رویوں کی داغ بیل تقریباً ۱۹۳۵ء سے پڑتی ہے، جب کہ ٹیگور کے انداز نے لکھنے والوں کو متاثر کیا، اور ہر طرف یہی ہلا چل پڑی۔ ٹیگوریت نے اردو کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے فکر و خیال کی مرکزیت اور دماغی سلجھاؤ کو چھین لیا۔ لفظوں کے برمحل استعمال میں بھی احتیاط کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ابہام اور اہمال لٹریچر میں داخل ہونے لگے، اس دور کی طرز نگارش کا ایک نمونہ یہاں پیش کرتا ہوں جو ای۔ ...میں نے قلم برداشتہ لکھا ہے۔

جھیل کی کائی پانی کے ہلکوروں سے پھٹی جا رہی تھی۔

مرغابیاں ——؟

خوبصورت اور حسین مرغابیاں ——
فرشتوں کی روحوں سے زیادہ معصوم مرغابیاں
جن کے پر زاہد مغرور کے قلب سیاہ سے زیادہ سیاہ تھے کلیلیں کر رہی تھیں
قدرت کے نیم ربانی آثار فضا میں لرزاں تھے ۔
ایک مرغابی نے دوسری مرغابی کی مرتعش منقار کو چوما ۔
آہ —!
نہ پوچھئے کہ میرے قلب نم دیدہ پر کیا گزری
تم یاد آگئے — تم — ہاں — تم —!
اور وہ ساحل گنگا کا منظر —۔
جب ہم تم دونوں ایک دوسرے کے گرم گرم ہاتھوں کو لئے ہوئے گھوم رہے تھے
تمہارے دل کی دھڑکن اور میری نبض کی رفتار کا ایک ہی مرکز تھا ۔
ایک ہی ساز کے دو پردے — ۔
مگر مضراب —!
اب تک نہیں معلوم کہ کہاں سے آئی اور پھر کون لے گیا ۔
مرغابیاں اڑ گئیں —۔
شکاری کی بندوق کو دیکھ کر —!
اور ہم بھی تو جامنوں کے پیڑوں کی آڑ میں چھپ گئے تھے
کسی — کو دیکھ کر —۔
قدرت کا انتقام بعض وقت بڑا دقیانوسی ہوتا ہے ۔
کاش ! وہ لمحے لوٹ کر آسکتے ۔
اگر مرغابیاں پھر اسی جھیل پر واپس آسکتی ہیں

تو ہم دونوں کو بھی ساحل دریا پر ایک دن اسی انداز سے آنا چاہیے
مگر ــــ

اُف ــ (جوانی)
خیر ــ محبت کی تاریخ اپنے کو دہرا کر رہے گی
سنگ تراش کے قرمزی مجسموں کے رنگ و روغن کی طرح

جاؤ ــــ!
تمہارے تصور کو "خدا حافظ" کہتا ہوں ــــ؟

تقریباً بیس سال (۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء) تک یہ سکۂ تلبیس یا یوں کہیے سکۂ جدید ادب کے بازار میں چلتا رہا، ہمارے بعض شعراء بھی اس سے متاثر ہوئے، اور شاعری میں بھی ابہال کا دور شروع ہو گیا، اس قسم کی شاعری کا ایک قلم برداشتہ نمونہ یہاں درج کرتا ہوں :-

محبوبہ سے

سازِ ناہید کے مضراب کی آواز ہے تو
جس کا انجام ہو نا پید وہ آغاز ہے تو
دستِ گلچیں کی طرح خانہ برانداز ہے تو
خالقِ قدرتِ رنگین کا اعجاز ہے تو

تیر سے ابرو کی کمانوں پہ مچلتا ہے مجھے

آسماں کو ترے سجدوں کی ضرورت کیا ہے
تیری تہذیب کا مفہوم عبادت کیا ہے
تیرے غم خانے میں ہنگامۂ عشرت کیا ہے

تیری رفتار ہے یس رو اور قیامت کیا ہے
تیغ کی دھار پہ شاید ابھی چلنا ہے مجھے

خونِ امید کو اک بار جو جگنو سا ہے شفق
دے رہی ہو مرے جذبات کو ہمدوشی سبق
تاکہ ہیں خود ہی الٹ دوں غمِ ماضی کا ورق
مجھ میں باقی نہیں اب صبر و تحمل کی رمق

اٹھ! کہ آئینِ محبت کو بدلنا ہے مجھے

اس قسم کی مہمل نظمیں رسالوں میں چھپتی رہیں۔ اور مشاعروں میں جہاں کسی خوش گلو شاعر نے پڑھا :۔

"ساز نا ہمیار کے مضراب کی آواز ہے تو"

بس شور مچ گیا۔ مہمل قسم کی مرعوب کن ترکیبیں سن کر اور پڑھ کر کالج کے طلبا متاثر ہوا کرتے تھے۔

وہ سمجھتے تھے کہ جو کلام رسالوں میں چھپتا ہے اچھا ہی ہوگا اور جن شاعروں کو مشاعروں میں بلایا جاتا ہے ان کی شاعری کو مہمل اور بے ربط سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں — پھر شعر و ادب پر نقد و نظر کا سلیقہ بہت دنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انسان کا ابتدائی دور تو اپنے ماحول اور گرد و پیش سے بہت کچھ متاثر ہوا کرتا ہے۔

اسی دور میں بعض صحیح الفکر شاعروں اور ادیبوں کی نظم و نثر کی قبولیت اور اشاعت کے باعث مہمل گوئی کا زور بہت کچھ کم ہو گیا۔ لوگ کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے لگے، اور بے معنی مغلق ترکیبوں کی مرعوبیت خدا خدا کر کے ختم ہوئی لیکن مہمل گوئی اپنا اثر بہرحال چھوڑ گئی۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے بعض شاعروں

اور ادیبوں کے یہاں جو مہمل نویسی اور انتشارِ خیالی پائی جاتی ہے اُس کا یہی
سبب ہے کہ انھوں نے اپنے بچپن یا اوائلِ شباب میں اس قسم کے نیم مہمل
ادب کا مطالعہ کیا۔ اور اس کے غیر شعوری اثرات سے وہ محفوظ نہ رہ سکے ۔
"ترقی پسند ادب" کے چکر میں پھنس کر رہ گیا، اور گمراہ ہو گیا۔

نیا ادب کیا ہے؟ آج تک کوئی سمجھ سکا اور نہ سمجھا سکا۔ "نئے ادب"
کا ہر نمائندہ نئے ادب کی نئی تعریف کرتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ کس کی بات صحیح
سمجھیں اور کس کو غلط ٹھہرائیں، ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "ترقی پسند جدید
شاعری کا، غالب اور میر سے نہیں، مرزا مظہر جانِ جاناں، ولی دکنی، آبرو اور
شاہ حاتم کی شاعری سے مقابلہ کرو۔ ہم اسی دور کی طرف واپس جا رہے ہیں۔"
آپ ہی فرمائیے کہ اس معقول بات کے جواب میں آپ کیا کہیں گے؟ ایسی عجیب
غریب بات کا جواب نہ تبسم ہو سکتا ہے اور نہ فریاد و ماتم۔ اسی گروہ کے ایک
رکن کہتے ہیں کہ شعر و ادب کے بنیادی احساس کی نوعیت یہ ہے کہ ہم کمرے میں
بیٹھے ہوں، ایک بلی کا بچہ وہاں آ جائے اور اس کے نرم بالوں کو چھونے
سے ہمارے بدن میں ایک قسم کی گدگدی سی پیدا ہو۔ بس وہی احساس "شگفتہ
احساس" ہے، جسے شاعرانہ اصطلاح میں "آمد" کہتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا،
ہمارے ترقی یافتہ دوستوں میں کیسا کیسا عقلمند موجود ہے کہ ان کی باتیں سنئے
اور دماغ کی اُپج اور فکر کی جدت طرازی کی اُس وقت تک داد دیتے رہئے جب
تک خود آپ کا دماغ خراب نہ ہو جائے۔ ایک طرف وہ شعور اشعوری کہ جب جدید
شاعری کا مقابلہ مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم کی شاعری سے کیا جاتا
ہے، اور دوسری طرف یہ بے تکی کہ ہر غزل گو شاعر کو قدامت پرستی، لکیر
کا فقیر اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ غزل کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ اس کو

ملوکیت اور سرمایہ داری کے قیام میں مدد ملتی ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ غزل سرمایہ داری کی حامی اور افلاس و غربت کی مخالف ہے۔ اس عجیب و غریب جدت فکر کی داد کن الفاظ میں دی جائے، نہ ہوئے آج گوا بن رشیق، پروفیسر براؤن اور حالی و شبلی جو اس تنقید کو سن کر بس غش ہی تو کر جاتے اس لئے کہ دماغ اور حواس ان خیالات کی مشکل ہی سے تاب لا سکتے ہیں۔

نئے ادب کے علمبردار تو کچھ بھی نہ سمجھا سکے۔ اُن کی کثرت تعبیر نے تو اس خواب ہی کو پریشان کر دیا۔ ہاں میں "ترقی پسند" ادب کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ پریشان خیالی، انتشار ذہنی، بے ربطی اور مہمل گوئی کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کو پڑھ کر طبیعت کو وحشت ہونے لگتی ہے۔ اور وہ "لٹریچر" جس میں اس درجہ جاذبیت نہ ہو خواص و عوام کے کسی طبقہ میں بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ترقی پسند دوست متفقہ طور پر "ترقی پسند" ادب کی اس تعریف و تشریح میں ہم زبان ہیں۔

"ترقی پسند ادب سے مراد وہ لٹریچر ہے جو زندگی اور سماج کے موجودہ مسائل کا آئینہ دار ہو"

سماج اور زندگی کے مسائل کا ذکر کرتے وقت ان کے ذہن میں "اشتراکیت" ہوتی ہے۔ میرا مضمون خالص علمی، اور ادبی ہے۔ سیاست و مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے میں یہاں "اشتراکیت" کی افادیت اور عدم افادیت سے بحث نہیں کروں گا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ صرف اشتراکی ادب کو "ترقی پسند ادب" کہنے سے اردو زبان میں فرقہ وارانہ بحث چھڑ جائے گی۔ اور ایک وہ شاعر و ادیب جس کے مضامین "شعریت و ادبیت" کے تمام ضروری اجزاء پائے جاتے ہیں لیکن وہ "اشتراکی" نہیں ہے، "تنزل پسندی اور رجعت پرستی"

کا الزام قبول کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوگا۔

شعر و ادب کی آج تک کسی ادیب و ناقد نے یہ تعریف نہیں کی کہ اسے کسی خاص سماجی تحریک کا پابند ہونا چاہیئے، "اشتراکیت" کی طرح "اسلام" بھی ایک تحریک ہے۔ لیکن آج تک مسلمانوں کی طرف سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ شعر و ادب میں اسلامی مسائل کو پیش کیا جائے۔ وہی ادب ترقی یافتہ ادب کہے جانے کا مستحق ہوگا جس میں اسلامی رجحانات پائے جاتے ہوں، اسی طرح ہندؤں، عیسائیوں اور دوسرے مذہبوں کی طرف سے بھی شعر و ادب میں وید اور بائبل کی تائید و تفسیر کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔

میں مسلمان ہوں، میرا ایقان ہے کہ اسلامی نظام ہی دنیا کا بہترین نظام ہے، میرا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ شعر و ادب میں اسلامی معتقدات و مسائل کی ترجمانی کی جائے، تاکہ دنیا فلاح و بہبود کے حقیقی اور فطری تصور سے آشنا ہو سکے لیکن اس یقین و اعتقاد کے باوجود میں اُن مضامین کو بھی شعر و ادب کا شاہکار سمجھتا ہوں جن میں اسلامی معتقدات کی ذرا سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ فردوسی کے شاہنامہ میں تو عرب مسلمانوں کے خلاف ایرانی عصبیت کا اظہار کیا گیا ہے۔

کہ تخت کیاں را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

تاریخی اعتبار سے بھی شاہنامہ کا کوئی درجہ نہیں ہے، فردوسی نے زیب داستان کے لئے اپنی طرف سے بہت کچھ بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ اس نے خود کہا ہے کہ رستم کو میں نے تیس مارخاں بنا دیا ہے، ورنہ وہ سیستان کا ایک پہلوان تھا۔ لیکن شاہنامہ میں چونکہ وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جن سے شعر ترکیب پاتا ہے، اس لئے میں شاہنامہ کو انتہائی قدر و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور خود ایران جہاں اُس وقت سے اب تک ہزاروں انقلابات آچکے ہیں شاہنامہ

کو صحیفۂ ادب سمجھا جاتا ہے، شعر و ادب کو کسی تحریک کا پابند بنانا شاعر اور ادیب پر بہت بڑا ظلم ہے۔ شعر و ادب میں تنزل و ترقی کا معیار کسی خاص سماجی یا تحریک کے رجحانات ہو ہی نہیں سکتے، ہم تو شعر و ادب میں اس حسن، تناسب، آہنگ اور ربط و تسلسل کو دیکھنا چاہتے ہیں جس پر شعر و ادب کا انحصار ہے۔ شعر و ادب کے پرکھنے اور جانچنے کی کسوٹی صرف "وجدان" ہے، ایک شخص غالب کے اس شعر کو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اچھا سمجھتا ہے، اور دوسرا شخص جو پہلے شخص سے زیادہ پڑھا لکھا ہے، ذوق کے اس شعر پر

واہ رے شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک — ہڈیاں میری ہما کس کس مزے سے کھائے ہے

سر دھنتا ہے۔ ارباب نظر اور صاحبانِ ذوق فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں میں کس کا "وجدان" سلیم اور صحیح ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت کی حمایت قوم و ملک اور سوسائٹی کے لئے زیادہ مفید اور ضروری ہے۔ مگر "شعر و ادب کی یہ تعریف قطعاً غلط ہے کہ "اشتراکی لٹریچر ہی ترقی پسند لٹریچر" ہے۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ "قدامت، رجعت اور تنزل" کی نشانی ہے۔

رنگینی اور نزاکت شعر و ادب کی جان ہے۔ اسی نقطہ سے تو شعر اور فلسفہ کی حدیں جدا ہو جاتی ہیں۔ مگر رنگینی اور عریانیت میں بہت فرق ہے، جو شخص اس فرق کو نہیں سمجھ سکتا اُسے شعر کہنے اور افسانہ لکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، شاعر اور ادیب تو عقیدت و پرستش، رحم و بزدلی، درگذر و انتقام خوف اور کمزوری، رنگینی اور عریانیت کے فرق کو سب سے زیادہ سمجھتا ہے "نئے ادب"

ہیں اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور "نفسیاتی تحلیل" کی آڑ میں ہر وہ بات بیان کی جا رہی ہے جو بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔

واقعہ نگاری بہت اچھی چیز بلکہ شعر و افسانہ کی جان ہے مگر بہت سے واقعات کھول کھول کر بیان نہیں کیے جاتے کہ تفصیل اور تشریح سے ان کا لطف جاتا رہتا ہے بہت سے شاعرانہ کنایے اور افسانوی اشارے تحلیل اور تفصیل کے عمل جراحی کو برداشت نہیں کر سکتے۔

دولھا دلھن کی شب خوابی کا اگر افسانہ کے بنیادی تخیل سے خاص تعلق ہے تو مسہری کی شکنوں، ٹوٹے ہوئے گجروں اور آنکھوں کے خمار جیسے اشاروں میں سب کچھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ ان اشاروں کو چھوڑ کر تفصیل و واقعہ نگاری پر اتر آئیں تو پھر رنگینی بے حیائی بن جائے گی۔ اور جس طرح کتے اور بندر بازاروں اور راستوں پر سب کچھ کرتے ہیں اور ان کی حیوانیت حجاب و بے حجابی میں امتیاز نہیں کرتی اسی طرح آپ بھی کاغذ پر کتوں اور بندروں کی طرح انسانوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

حجاب، اشارہ، کنایہ اور اجمال حقیقت، شعر، ادب، انسانیت، اخلاق اور پاکیزگی جبات کی لطیف اور فطری ترجمانی ہے، آپ کہتے ہیں۔

"میں صبح کو حوائج ضروری سے فارغ ہو کر باہر چلا گیا"۔

اب کوئی "حوائج ضروری" کے اجمال کی تفصیل کرنا شروع کر دے اور مخصوص اعضا کے قبض و بسط سے لے کر بیت الخلا کے قدمچوں تک کا حال بیان کرے تو آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ اس "واقعہ نگاری" کو ذوق سلیم کس طرح برداشت کر سکے گا۔

"نیا ادب" واقعہ نگاری اور حقیقت کی ترجمانی کی رو میں وہاں پہنچ

گیا ہے، جہاں "ادب" اور "بے ادبی" میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا، وہاں "بھاٹ" اور "پھسلن" جیسے افسانوں پر فخر کیا جاتا ہے، اور کوئی اس بے حیائی پہ معترض ہوتا ہے تو بارگاہِ ترقی پسندیت سے فرمان صادر ہوتا ہے :-

"ان برائیوں کی تفصیل اور واقعات کو علی ٹھیک ٹھیک ظاہر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان برائیوں سے نفرت کرنے لگیں"

حالانکہ برائیوں اور بے اعتدالیوں کو چٹخارے لے لے کر بیان کرنے سے برائی کی تبلیغ ہوتی ہے اور پڑھنے اور سننے والے نفسی ہیجان کا شکار ہو جاتے ہیں "

صبح کے وقت مکانوں کی کھڑکیوں دیکھ کر کوئی شخص ان الفاظ میں تفصیل بیان کرتا ہے۔

"میں نے صبح کے وقت مکانوں کی کھڑکیوں سے تاک جھانک شروع کی میری نگاہیں کھلے ہوئے سینوں کے ابھار اور افتادگی پہ جم کر رہ گئیں، گردن سے لے کر ناف کی گہرائی تک جسم کے بعض حصے کھلے ہوئے تھے، میری بے باک نگاہیں اترتی ہی چلی گئیں ۔۔۔"

لیکن اس کیفیت اور مشاہدے کو دوسرا شخص ان الفاظ میں پیش کرتا ہے

صبح کے وقت وہ ماحول شبستانوں کا   وہ مکانوں کے دریچوں کا نظارہ آہستہ

اس اجمال اور اس تفصیل کا موازنہ کر کے دیکھئے اور انصاف سے بتائیے کہ دونوں عبارتوں کو پڑھ کر آپ کا وجدان کس چیز کا بہتر اثر قبول کرتا ہے اور شعر و ادب کا حسن و تناسب کس طرح بیان میں ہے۔

بالیقین ورس کی جتنی نظمیں اس وقت تک ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں سے ایک نظم بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے اردو ادب میں کوئی درجہ

دیا جاسکے بعض مصرعے یا ٹکڑے البتہ شگفتہ ہیں لیکن بلینک ورس کے دوسرے
بے ربط اور بے تکے اجزا سے مل کر یہ شگفتگی بھی مذاق بن کر رہ گئی ہے۔

"بلینک ورس" میں ذہن انسانی کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے
اور شعر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ سامع کا ذہن شعر سن کر اثر قبول کرے، بلینک ورس
میں آہنگ، ترنم اور تناسب کا فقدان ہے اور شعر ان ہی حسین اجزا سے ترکیب
پاتا ہے۔ بلینک ورس شاعری کے ساتھ ایک قسم کا مذاق ہے، مذاق اگر مذاق
سمجھ کر کیا جائے تو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن جب "مذاق" کو "سنجیدگی" سے
تعبیر کیا جائے تو بیہودگی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ "بلینک ورس" اردو شاعری میں ایک تجربہ
کی حیثیت رکھتی ہے، ہمیں تجربہ کے نتیجہ کا انتظار کرنا چاہئے، ابھی سے شور مچانے
اور واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ بعض تجربے ایسے بھی ہیں جن کی خرابی
اور مضرت ابتدا ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ لہذا ایسے تجربوں کا ابتدا ہی میں گلا
گھونٹ دینا چاہئے۔ تاکہ آگے چل کر مضرت اور خرابی کی اشاعت ہی نہ ہو سکے
برائی اور غلطی کو ڈھیل دینا عقلمندی کی بات نہیں، ہر جگہ رواداری اور
تحمل کا استعمال اچھا نہیں ہوتا۔

ایک ناموزوں طبع آسانی کے ساتھ بلینک ورس کہہ سکتا ہے، اس طرح
بلینک ورس کے حامی ناموزوں طبع اشخاص کو شاعروں کی صف میں لانا چاہتے
ہیں اور وہ جن کو شعر گوئی کی صلاحیت ہی قدرت کی طرف سے عطا نہیں کی گئی خود
کو "شاعر" سمجھ کر اپنے غیر شاعرانہ افکار سے جو ظلم ڈھائیں گے اس کے نتائج کی
خیال ہی سے میرا تو دل کانپا جاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو نثر میں اپنے خیالات

بہتر طریقہ پر ادا کر سکتے تھے شاعر بننے کے خبط میں بلینک ورس کہہ کر ایک طرف تو شاعری کی مٹی پلید کریں گے اور دوسری طرف نثر نگاری کی صلاحیت بھی زنگ آلود ہو جائے گی۔

متقدمین اردو شعرا، فارسی اور عربی کے جاننے والے تھے مگر انہوں نے عربی کی بہت سی مزاحف بحروں کو اردو شاعری میں استعمال نہیں کیا۔ اردو شاعری کا مزاج اُن بحروں کے لیے ناموافق تھا۔ عربی کے دو شعر ہیں :-

یاجامعاخلق النبو ۃ والخلافۃ فی قرن

المستقر من الخلا فۃ فی الشواهق والقنن

پہلے شعر میں لفظ "نبوت" کے ٹکڑے کر دیئے گئے اور وہ بھی اس طرح کہ "نبو" پہلے مصرعہ میں اور "ت" دوسرے مصرع میں نظم کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے شعر میں لفظ "خلافت" کے "خلا" کو پہلے مصرعہ میں اور "فت" کو دوسرے مصرعہ میں باندھا گیا۔

عربی جاننے والے اردو شعراء اگر چاہتے تو اردو شاعری میں اس چیز کو پھیلا سکتے تھے، اور اردو ادب کے لئے یہ بے شبہ ایک نئی چیز ہوتی مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا کہ اردو شاعری کا مزاج اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ حالانکہ عربی زبان مشرق کی زبان ہے، اُس کے بہت سے لفظ اردو میں مروج ہیں اور عربی گرامر اور عربی عروض سے اردو شاعری بہت کچھ متاثر ہے۔ اتنا کچھ ہونے پر بھی اُن محسنین اردو نے اردو کی انفرادیت کو باقی رکھا۔

مگر ہمارے یہ انگریزی پڑھے ہوئے آزاد خیال شعراء، جو سر آن انقلاب کے نعرے لگاتے ہیں، مغرب سے ذہنی طور پر اس قدر مرعوب ہیں کہ "بلینک ورس" کو جو اردو شاعری کے مزاج کے مخالف ہے اردو شاعری پر

زبردستی مسلط کر دینا چاہتے ہیں۔ "ملبنیک ورس" حقیقت میں غلامانہ ذہنیت کی نشانی ہے اور قیامت تو یہ ہے کہ اس "مرعوبیت" "غلامی" اور "محکومیت" کو جدت اور آزاد خیالی کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ سچ کہا اقبال نے۔

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے انساں کا ضمیر

"نئے ادب" یا "ترقی پسند ادب" پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں لفظ کی قدر و قیمت اور "value" نہیں ہے، لفظ کے برمحل اور بے محل استعمال میں یہاں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ جہاں چاہا جو لفظ استعمال کر دیا۔ اظہار خیال کے لئے متناسب اور موزوں لفظ استعمال کرنے سے نہ جانے مقصد گریز کیا جاتا ہے یا الفاظ کے صحیح معنی ہی معلوم نہیں ہیں۔ وہاں دروازے کے کواڑوں کو "بے خواب" اینٹ پتھر کو "مخمور" اور ٹوپی کے پھندنے کو "ڈگمگاتا اور لڑکھڑاتا ہوا" کہا جا سکتا ہے اور تدبیر، تقدیر اور تنفیر کے سینے میں بندوق کی گولیاں پیوست کی جا سکتی ہیں۔ "نئے ادب" میں جھیل کے پانی پر تیرتی ہوئی کائی بھی انگڑائی لے سکتی ہے اور پہاڑ کی چوٹی کو جماہیاں آ سکتی ہیں۔ وہاں افسانہ کا عنوان "حیوانی کی سر اند" ہو سکتا ہے۔

شعر و ادب میں "خیال" سے زیادہ "لفظ" کی قدر ہے۔ کیونکہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیال بھی نامناسب لفظوں کے قالب میں ڈھل کر لعوین جاتا ہے۔ اور درف لفظوں کی نشست اور تناسب سے معمولی بات بھی "سحر حلال" بن جاتی ہے، دنیا کی جس زبان کے شاعر و ادیب کی تصنیفات اٹھا کر دیکھو تم کو محسوس ہو گا کہ خیال کے ساتھ الفاظ کا انتہائی برمحل استعمال کیا گیا ہے۔ اور زبان کی نزاکتوں کو شعر و ادب میں سمو دیا گیا ہے۔ الفاظ کا یہی تناسب اور "آہنگ" لٹریچر کی روح بن گیا ہے۔ دنیا کی جتنی مشہور مقدس اور آسمانی کتابیں ہیں۔ وہ زبان کے

کی لحاظ سے بہترین نمونہ ہیں۔ کہ نفس انسانی الفاظ و بیان کی دلکشی ہی سے متاثر
ہوتا ہے

گرنیا اصب جو زبان کا دشمن ہے۔ وہاں زبان کی پابندیوں کا نام "قدامت"
ہے رکھا جاتا ہے کہ ہم چونکہ بہت سے محاوروں اور اصطلاحوں کے سننے کے عادی
ہو گئے ہیں اس لئے ان کے مخالف لفظ و ترکیب کو سن کر ذہن پریشان ہونے لگتا
ہے جب ان نئے الفاظ کو ہم بار بار سنیں گے تو ان کے سننے سے جو پہلے پہل وحشت
ہوتی ہے رفتہ رفتہ اس سے بدل جائے گا۔

یہ خیال انتہائی خطرناک، لغو، بیہودہ اور غیر فطری ہے کہ پرانی چیز کو خواہ
وہ کتنی ہی اچھی ہی کیوں نہ ہو، بدل دینا چاہیئے۔ دنیا میں کسی چیز کو اسی وقت بدلا
جاتا ہے کہ یا تو اس کی خرابیوں کا احساس ہو جائے یا اس سے بہتر اور ترقی یافتہ چیز
مل جائے۔ تمدن میں جتنی چیزیں عام طور پر بدلی گئی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ
اچھی، مفید اور کارآمد چیزیں ظہور میں آتی رہیں اور بدل کا سلسلہ اصول یہ ہے
کہ جب تک پہلی چیز سے زیادہ بہتر چیز نہ ملے یا ہم سے کم اس کا بدل نہ ملے اس وقت
تک پہلی چیز کو نہ بدلا جائے۔ کوئی شخص یہ کہے کہ کھانا الٹے ہاتھ سے کھانا چاہئے یہ
ہاتھ آخر کیوں بیکار رہے اور ہم چونکہ ہمیشہ سے سیدھے ہاتھ سے کھانا کھانے کے عادی
رہے ہیں اس لئے سیدھے ہاتھ کھانا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے جب چند دن تک الٹے
ہاتھ سے کھاتے رہیں گے تو اس کی عادت پڑ جائے گی یقیناً ایسا ہو سکتا ہے لیکن
دریافت طلب امر یہ ہے کہ الٹے ہاتھ سے کھانا کھانے میں آخر خوبی کیا ہے۔ اور
سیدھے ہاتھ سے کھانا کھانے کے مقابلہ میں ترقی کیا ہوئی۔ عادت بہت سی برائیوں
کو گوارا کر لیتی ہے لیکن کسی برائی کے گوارا کر لینے سے برائی کا برا پن تو دور نہیں
ہو سکتا۔ اردو زبان میں اگر غلط عنصر تھا [illegible] الفاظ اور تراکیب کو گوارا

کر لیا گیا تو زبان و ادب کا وہ فطری حسن جو اک میں پڑ جائے گا جو انسان کے وجدان کو اسی طرح متاثر کرتا ہے جس طرح خوبصورت چہروں اور اچھے مناظر کو دیکھ کر نگاہ متاثر ہوتی ہے۔ اب تک جو اُردو زبان ہندوستان میں اور پاکستان سے باہر اس قدر تیزی کے ساتھ پھیلی ہے اس کا یہی سبب ہے کہ زبان میں فطری کشش اور جاذبیت پائی جاتی ہے اور اس ساز کا ہر پردہ ہم آہنگ ہے "نیا ادب" زبان و ادب میں بدنما جدتوں کا اضافہ کر کے اردو کو تباہ کر رہا ہے اور اگر اس بے راہ روی کو سدباب نہ کیا گیا تو اردو زبان ایک ٹوٹا ہوا ساز بن کر رہ جائے گی اور اس میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی۔

"نئے اور ترقی پسند ادب" کے وہ حامی جو ذوقِ سلیم رکھتے ہیں اور جن میں سے بعض واقعی بہترین انشا پرداز ہیں ان کی خدمت میں میری گزارش ہے کہ کم سے کم اس بے راہ روی کے خلاف تو وہ آواز اٹھائیں کہ زبان "انقلاب و بغاوت" اور "عریانیت و حقیقت نگاری" کے نام پر ذبح کی جا رہی ہے اس وقت خاموشی "معاونتِ قتل" اور "تعاون علی الاثم" سمجھی جائے گی۔

اردو زبان بہت سے مراحل سے گذرنے کے بعد ترقی یافتہ صورت اختیار کر چکی ہے ہم ہیں کا ہر اردو لکھنے والا اور بولنے والا اس "ترقی یافتہ زبان" کا نمائندہ ہے کسی خاص جماعت کو "بعض" سیاسی یا سماجی خیالات" کے تحت اپنے کو "ترقی پسند" کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "ترقی پسند ادیب و شاعر" تو وہ لوگ ہیں جو صحتِ فکر کے ساتھ زبان و ادب کو فروغ دے رہے ہیں اور یہ "کاذک قسم" کے ادیب و شاعر تو نہ "رجعت پسند" ہیں اور نہ "ترقی پسند" یہ تو ہوا کے اس لٹو کی طرح ہیں کہ جو گھومتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر سے اپنا مرکز بدلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخری چکر لے کر زمین پہ گر پڑتا ہے۔

نیا ادب میری نظر میں

میرا جی

نئے پرانے کی بحث آن پڑی ہے خدا خیر کرے، بزرگوں سے سنا ہے کہ جب کبھی
کہیں دو انسانوں کو جھگڑتے دیکھو تو چپکے سے آگے بڑھے چلو، اور اب تک ادب میں میرا
رویہ یہی رہا ہے، اسی لئے یہ اندیشہ اس وقت بھی ہے کہ کہیں جھگڑا چکاتے چکاتے خود
ہی کسی الجھن میں نہ گرفتار ہو جائیں مگر کیا کیا جائے جب تک سانس جاری ہے لاگ اور
لگاؤ کی باتیں ضروری ہیں چنانچہ چپکا بھی نہیں رہا جاتا۔ تو آئیے سب سے پہلے یہ سمجھنے
کی کوشش کریں کہ نیا اور پرانا بنفسہٖ بھی کوئی تصور ہے کہ نہیں۔

انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ اس سورج کے نیچے کوئی بات نئی نہیں ہے مگر
وہ لوگ جن کے کاموں کو بعض حضرات پرانے بنتے ہوئے نیا کہنے لگے ہیں انجیل جیسی پرانی
ب کو کب خاطر میں لائیں گے کیونکہ انجیل تو دنیا کے اس ادب کا نمونہ ہے جو کبھی نہیں
سکتا، جب تک زندگی ہے اس کی اونچ نیچ بھی قائم اور اسی آخری لمحے تک
بلند مرتبہ بھی وہ سرے پرانے ادب کے ساتھ ہی ساتھ مسلّم۔ تو چلئے انجیل سے
کرتے ہیں لیکن اگر کوئی نئی کتاب پیش کی تو وہ آپ ہی اپنا دعویٰ اور اس کی دلیل

اس لئے شاید اگلے وقتوں والے اس پر بھی معترض ہوں۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت
چاہیے کہ ہر شخص اپنے آپ میں گمسا رہتا ہے، ہر شخص کے لئے "میں کہتا ہوں"
نطق وہ سورج کے کہنے سے کہیں زیادہ ہے، میں بھی انسانی فطرت سے اب تک

رہائی نہیں حاصل کرسکا اس لئے پیچھے میں کہتا ہوں کہ آخر وہ کیا باتیں ہیں جن کی طرف اس دور میں معمول سے زیادہ رغبت کی بنا پر اگلے وقتوں والے آج والوں کو (بلکہ بعض مثالوں میں آنے والی کل والوں کو) نیا کہنے لگے ہیں، وہ ادب جسے آج کل نیا کہا جا رہا ہے اس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی کچھ باتیں تو سیاسی ہیں کچھ جنسی اور کچھ محض اقتصادی۔ لیکن کیا سیاست، جنس اور اقتصادیات سے متعلق مسائل صرف آج کل ہی کی پیداوار ہیں؟ جب آدم کی بائیں پسلیوں میں سے ایک نے عورت کا روپ دھارا جنس اس لمحے سے انسان کے لئے غور و فکر کا موضوع ہے۔ جب قابیل نے ہابیل کی متاعِ مسرت پر قبضہ پانے کے لئے خود غرضی کو کام میں لاتے ہوئے اس کا خون کیا سیاست شروع ہوئی اور اس کے بعد جب قابیل کی اولاد نے اپنی اولاد کے لئے اور باہمی برتری کے لئے غلہ جمع کرنا شروع کیا اور زیادہ سے زیادہ زمینوں پر قبضہ جمانے کی ٹھانی تو اقتصادیات کا آغاز ہوا۔ تو پھر یہ موضوع تو نئے نہ ہوئے بلکہ ان پر سوچ بچار بھی نئی نہیں کیونکہ یہ زندگی کے آغاز ہی سے زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ ہاں اس بدلتی دنیا میں ان موضوعات کے بدلتے روپ اپنے اپنے چار دنوں کے لئے نئے رہے۔ پھر بات کیا ہے؟ ——— بات یہ ہے کہ آج بھی ہماری سماج میں بدلتی ہوئی کیفیات کا دور دورہ ہے، یہی وجہ ہے کہ نئے پرانے کا سوال پیدا ہوا، تو پھر آیئے اس نئے پرانے کے تصور کو سمجھنے کے لئے ذرا اپنی بدلتی ہوئی سماج ہی کا ایک سرسری سا جائزہ لیں۔

ایک زمانہ تھا کہ یہ کرۂ ارضی سورج سے الگ ہو کر ابلتی ہوئی دھاتوں اور بھبکتی ہوئی گیسوں کا ایک مجموعہ تھا۔ لکھوکھا سالوں کے بعد سکون کا زمانہ آیا، رفتہ رفتہ یہ سکون ایک سکونِ مطلق میں بدل گیا ——— برفانی سکون۔ اور پھر جب زمین سورج سے اپنی جدائی کا غم بھول گئی تو سورج کی دور دراز سے آتی ہوئی کرنوں نے

اس برف کو پگھلانا' اس سکون کو منتشر کرنا شروع کیا۔ لیکن زندگی صفحۂ ہستی پر نمودار ہو چکی تھی اور جب قطبین سے برف پگھلنی شروع ہوئی اور زمین کے گرداگرد سمندروں کا لباس زیبِ تن ہونے لگا تو اس محشرِ انقلاب میں زندگی کے قیام و بقا کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ کیونکہ زندگی تو گرمی اور گرمجوشی ہی کی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جس طرح انقلاب کا محشر اس کی معتدل رفتار کے لئے مضر ہے اسی طرح انجماد بھی اس کا دشمن۔ انجماد سے بچ کر انقلاب کے محشر سے دوچار ہونا مجبور سے گرنے کے مماثل تھا لیکن زندگی کا خاصہ یہ بھی ہے کہ مخالف طاقتوں کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے۔ چنانچہ سیلابوں، طوفانوں اور زلزلوں کی اس دار و گیر میں جو حیوانِ مطلق اپنے آپ کو نئی صورتِ حال کے مطابق ڈھالتے گئے، زندہ رہتے گئے، جنہوں نے حالات کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا وہ مٹتے گئے۔ اور آج ماہرینِ علم چٹانوں میں دبی ہوئی ان کی ہڈیاں دریافت کر سکے ہیں۔ زندگی کی یہ صورتیں جو چٹانوں میں ہمیں ملی ہیں اپنے زمانے میں اپنی مکمل صورت کو پہنچ چکی تھیں۔ بقا کے سلسلے میں ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ نئے حالات کے مطابق وہ اپنی صورتوں کو ڈھال نہ سکے۔ آج بھی نئے پرانے کی جو بحث چھڑی ہے اس میں نئی صورتیں وہ صورتیں ہیں جو وقت کی پگھلتی ہوئی برف کا مقابلہ کرنا چاہتی ہیں۔ اور پرانی صورتیں وہ صورتیں ہیں جنہوں نے اگر اپنے آپ کو نہ بدلا تو کسی دن ماہرینِ علم کے لئے دھرتی کی تہوں میں دبی ہوئی ہڈیاں ہونگی۔

ہر حیوان چاہے مطلق ہو یا ناطق اگر دماغ سے کام نہیں لے سکتا۔ اگر کسی بات کے بارے میں کسی قسم کی جانبداری کے بغیر سوچ کر انفرادی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تو وہ مطلق اور ناطق تو الگ حیوان بھی نہیں بلکہ ایک مشین ہے اور مشین بھی پرانی زنگ آلود، کیونکہ نئی مشین تو نہ صرف نئے طریق پر کام کرتی ہے بلکہ ابتدائی استعجاب کے بعد اپنے دیکھنے والوں میں بھی نئے تاثرات، نئے خیالات پیدا کرتی ہے۔ آج تخلیقِ حیاتیات

کے کارخانے میں ایک نئی مشین ایک نیا حیوان ناطق ہر کسی کو دکھائی دے رہا ہے لسے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دل و دماغ میں نئے تاثرات، نئے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور وہ ترقی کرتے ہوئے ایک مشین سے ہٹ کر ایک آزاد حیوانِ ناطق بننا چاہتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں صرف اس کی حیوانیت پر نگاہ رکھتے ہیں، اس کے نطق پر صحیح انداز سے غور نہیں کرتے، اسی لئے ان کے دل و دماغ اس سے کوئی بھی صحت مندانہ تاثر نہیں لیتے، ان کے ذہن میں حسد کی ایک دبی ہوئی صورت کے علاوہ کوئی بھی احساس نہیں پیدا ہوتا کیونکہ اس نئے حیوانِ ناطق کے سامنے وہ خود کو ایک پرانی مشین محسوس کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت اگر آپ چاہتے ہوں تو سنئے :-

غدر کو آج تقریباً تین کم نوے سال ہوتے ہیں وہ ہندوستانی جنہیں اپنے سن شعور میں اس قومی ہنگامے سے سابقہ پڑا آج ان کی اولاد کی اولاد سنِ شعور کو پہنچ چکی ہے، اس اولاد کی نسلی یادیں ابھی ایک صدی کے گھیرے میں ہیں، دور کے ماضی کے دھندلکے میں آسودہ نہیں، اس لئے اگر ہمیں پوتے کی تحقیقات کا جائزہ کتنی گہرائی کے ساتھ مقصود ہو تو ضروری ہے کہ ہم دادا کے حیاتی تاثرات سے ابتدا کریں، کیونکہ آج کل کے ادب میں جو مسائل سب سے نمایاں نظر آتے ہیں ان کی ابتدا بھی اسی زمانے سے ہوئی ہے بدلتی ہوئی سیاست، بدلتی ہوئی اقتصادی حالت، بدلتی ہوئی سماجی کیفیات —— ان سب کی نشوونما گذشتہ سو سال میں ممتاز دکھائی دیتی ہے۔ آج کے روز آج سے سو سال پہلے کے ہندوستانی فرق صرف اتنا ہے کہ دادا زندگی کے ہر مسئلے کو صرف اپنے ملکی اور قومی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن پوتا انہی مسائل کو بین الاقوامی زاویۂ نگاہ سے جانچنے کا عادی ہوا جا رہا ہے۔ اس عادت کو پختہ کرنے میں اخبار سینما اور ریڈیو کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ اور گذشتہ اور موجودہ جنگ ہائے عظیم اس سلسلے میں عظیم معاونین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غدر سے بہت پہلے اس زمانے کے

پڑھے لکھے انسان کو اپنی حکومت جاتی اور دوسرے کی حکومت آتی دکھائی دے رہی تھی اور اسی کے نتیجے کے طور پر آسے اپنی دولت، اپنی اقتصادی حالت کا استحکام بھی مشتبہ نظر آ رہا تھا۔ نئے حاکم کا اثر سماج پر بھی لازمی ہے اس لئے اسے اپنی سماجی روایات بھی معرضِ خطر میں محسوس ہو رہی تھیں۔ اور ان اندیشوں اور تذبذب کی اضطراری حالت میں ایک زلزلہ سا آیا، غدر —— جس نے ثابت کر دیا کہ زندگی تو آنی جانی ہے۔ زندگی کی مختلف کیفیات —— خوشحالی، فارغ البالی، سکونِ قلب، ہر بات وقتی ہے، اس پر آشوب زمانے کے انسان نے کیا کچھ نہیں دیکھا، اپنی دولت غیروں میں بٹتی دیکھی، اپنا گھر اُجڑتے دیکھا، اپنی ماؤں بہنوں بیویوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لٹتی دیکھیں، اپنے عزیزوں کی جانیں مٹتی دیکھیں —— اور اس نے سوچا کہ جب ہر بات وقتی ہے تو کیوں نہ ہم بھی وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہیں، ہم بھی کیوں نہ ابن الوقت بن کر زندگی گذاریں، چنانچہ اس نے اِسی مسلک کی طرف توجّہ کی۔ ابھی اسے اپنے اس نئے اصولِ حیات پر پورا پورا عمل کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ اُس کی ہستی کا فطری انجام آ پہنچا۔ اس لئے اس کے بعد اس کی اولاد نے اس کا بیڑا اٹھایا، اور وقت کے ساتھ بہتے ہوئے زندگی کے رستے پر ترقی کی طرف قدم بڑھائے۔ لیکن اس بڑھت کے عرصے میں اس کی زندگی کا انجام بھی آ پہنچا۔ دادا نے وطن کے آئینے میں سب کچھ دیکھا تھا، بیٹے کے آئینے میں کچھ اور رنگ بھی جھلکنے لگے اُس کی زندگی کے آخری لمحے گذشتہ جنگِ عظیم کی پیشگوئی کے ساتھ ختم ہوئے۔ اب پوتے کے بڑھنے پھولنے کا زمانہ آیا اور وہ دادا اور باپ دونوں کا ردّ عمل بن کر ظاہر ہوا۔ پوتے کی زندگی دادا اور باپ دونوں سے زیادہ ہنگامہ پرور دور سے گذر رہی تھی مگر اسے اپنے سے پہلوں کی زندگی ہنگامی دکھائی دی اس لئے اُس نے سوچا کہ باپ اور دادا کو سکونِ قلب کے ساتھ مسائلِ حیات پر غور کرنے کا موقع نہ ملا اور قدیم تاریخ کی شکست اور زوال نے پرانی

قدریں بھی ملیا میٹ کر دیں، اس لئے مجھے ہر بات پر از سر نو غور کر کے نتیجہ نکالنا چاہیئے۔ اس انداز تفکر نے بین الاقوامی اثرات کے ساتھ مل کر انفرادیت پرستی کو پرورش کیا اور فروغ دیا اور پوتے نے ہر بات کو اپنی ہی نظر سے دیکھنا شروع کیا بہت سی باتوں کو اس نے صحیح طور پر دیکھا کیونکہ اسے بعض جدید علوم و فنون سے بھی آگاہی تھی، مگر بعض باتوں کو وہ صحیح طور پر نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کی انفرادیت آزمائش کے لمحوں میں ہمیشہ پوری نہ اترتی تھی، باپ نے بیٹے کی اِن تمام حرکتوں کو دیکھا اور اپنی بڑائی کے زعم میں غلط باتوں کو زیادہ اہمیت دے کر موردِ الزام ٹھہرایا کیونکہ اس کے ذہن میں غیر شعوری طور پر شاید حسد کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ترقی جو اپنے باپ کے زمانے کے ردِ عمل کے طور پر مجھ کو کرنی چاہئے تھی میں نہ کر سکا اس لئے اِس نوجوان کو، اس کل کے چھوکرے کو اس کی غلطیوں کا احساس دلا کر ہی نیچا دکھایا جا سکے گا۔

آج نئے ادب (؟) پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں انہیں نئے ادب پر کوئی اعتراض نہیں، ہر زمانے میں ترقی کی طرف بڑھنے والا ادب نیا ادب کہا جا سکتا ہے ایک وقت تھا جب اُن کی ادبی تخلیقات نیا ادب تھیں، ان کی تخلیقات کا زمانہ گزر چکا، مگر وہ خود اب بھی باقی ہیں اس لئے انہیں اعتراض ہے نئے ادب کے لکھنے والوں پر جو اُن کی ہستی کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کو اصولوں کو دل سے بھلاتے ہوئے زندگی کے رستے پر بڑھ رہے ہیں ــــــ اور اسی لئے ان کی رائیں تنقید نہیں بلکہ اُن کے احساسِ کمتری کا اظہار ہیں۔

نیا ادب میری نظر میں

نیاز فتح پوری

زمانے میں اس قدر تدریج کے ساتھ تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں کہ قوس قزح کے رنگوں کی طرح ان کی کوئی صحیح حدِ فاصل قایم کرنا دشوار ہے، لیکن اگر آپ درمیان کی ایک دو کڑی چھوڑ کر غور کریں تو یہ تغیر بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔

اس وقت جو لوگ زندہ ہیں ان کو شاید یہ سمجھنے میں دقت ہو کہ ان کی زندگی میں دنیا کتنی بدل گئی، لیکن اگر اب سے ۱۰۰ سال قبل کا کوئی انسان زندہ ہو جائے، تو وہ دنیا کے تغیرات کو دیکھ کر حیران رہ جائے گا حالانکہ جن نسلوں کے سامنے یہ تدریجی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے لئے ان میں کوئی بات حیرت کی نہ تھی۔ اسی طرح ہمارے زمانے میں جو تبدیلیاں شاعری میں ہوئی ہیں، ممکن ہے ان کو ہم پوری طرح محسوس نہ کریں لیکن اگر داغ و امیر زندہ ہو جائیں اور ان کے سامنے اس وقت کی شاعری کا تمام ذخیرہ رکھدیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یا تو وہ غصہ کے مارے کانپنے لگیں گے، یا اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے ان کے قلب کی حرکت فوراً بند ہو جائے گی۔

یقیناً یہ تغیر بہت بڑا تغیر ہے، اور زمانے کا اقتضا ہمیشہ ایسی ہی عظیم الشان تبدیلیاں کرتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا، لیکن چونکہ زمانے کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے، کبھی وہ انسانی تمدن کے مزاج کے موافق ہوتے ہیں اور کبھی ناموافق، اس لئے یہ تبدیلیاں بھی اسی اعتبار سے کبھی

موزوں ہوتی ہیں اور کبھی ناموزوں۔

سب سے بڑا انقلاب جس کو تاریخ میں بڑی اہمیت دیجاتی ہے حکومتوں کا انقلاب ہے، جو براہ راست انسان کے طبعی میلانات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی معیشت و معاشرت اور زبان و خیال سب کو بدل دیتا ہے —— قدیم ہند کو چھوڑیئے، اگر آپ سلطنت مغلیہ کے زوال سے لے کر اس وقت تک کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو بین طور پر یہ فرق محسوس ہوگا۔

زبان ہمارے ذہن و احساس کی ترجمان ہے، اس لئے جب کسی قوم کی ذہنیت میں انقلاب رونما ہوگا تو لازماً اس کی زبان اور اسی کے ساتھ انداز بیان میں بھی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئے تجربات، نئے معلومات، نئے نظریئے اپنے ساتھ نئے الفاظ، نئے محاورے اور نئے اسالیب بیان بھی لاتے ہیں، اور یہ کہنا غالباً خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ پچھلی جنگ کے بعد سے ان چیزوں کی "درآمد" اتنی تیزی سے ہوتی ہے کہ ہم کو انہیں سنبھالنا دشوار ہو گیا ہے۔

پچھلی جنگ نے دنیا کو سبق دیئے ایک یہ کہ تعمیر کے لئے تخریب ضروری نہیں اور دوسرے یہ کہ کبھی کبھی تخریب سے ایسی تعمیر بھی رونما ہو جاتی ہے جو ذہن و خیال میں بھی نہیں ہوتی۔ پہلے سبق کے لئے معاہدۂ ورسائی کے نتائج کا مطالعہ کیجئے اور دوسرے کے لئے روس کی بالشویک حکومت کے قیام کا! اس میں شک نہیں کہ ہندوستان نے ایک دست و پا شکستہ ملک ہونے کی حیثیت سے اثر کو زیادہ قبول نہیں کیا، لیکن انعکاسی تاثر قبول کر لینا ناگزیر تھا اور چونکہ یہاں کی اقتصادی دشواریاں بھی قریب قریب روس ہی کی طرح تھیں اور آزادی کا احساس پہلے ہی کچھ پیدا ہو گیا تھا، اس لئے انقلاب روس کی داستان کو لوگ بڑے شوق سے سننے لگے اور اس کی ہر چیز انہیں اچھی معلوم ہونے لگی۔

ہر چند انقلاب روس اور بالشیوک حکومت کے متعلق جو لٹریچر ہندوستان تک پہونچا، وہ کوئی "خالص" چیز نہ تھی، تاہم اندازہ کرنے والوں نے کچھ نہ کچھ اندازہ کر ہی لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف حلقۂ کانگریس بلکہ سارے ملک میں ہر طرف سے "اشتراکیت" کا نام کانوں میں آنے لگا اور انسانی آزادی کے وہ مارکسی نظریے، جن کو لینن نے علمی حیثیت سے جدا کر کے عملی حیثیت سے پیش کیا، جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا موضوع گفتگو بن گئے، جو پہلے ہی سے اپنی بیروزگاری کا انتقام لینے کے لئے کسی نہ کسی ہنگامہ کا انتظار کر رہے تھے۔

مشرقی اخلاق کے نقوش پہلے ہی مغربی تعلیم کی وجہ سے دھندلے ہو گئے تھے اب "اشتراکیت" نے ان کو بالکل ہی مٹا دیا اور ہماری نئی نسل نے زندگی کو آن زاویوں سے دیکھنا شروع کیا، جو خود ان کے اپنے نہ تھے اور اس کا اثر ہمارے ادب پر بھی بہت گہرا پڑا، اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری کی ابتدا مثنوی اور غزل سے ہوئی لیکن شاعری کی تاریخ میں ہم کو کہیں کہیں ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں، جنہوں نے ان حدود سے ہٹ کر اپنے بیان کے لئے "کچھ اور وسعت" بھی پیدا کی۔ اور ان افراد میں سب سے پہلا نام نظیر اکبر آبادی کا نظر آتا ہے۔

نظیر کے بعد ایک طویل زمانہ تک کوئی شخص سرزمین شاعری سے ایسا نہیں اٹھا جو اس بدعت کا حامی ہوتا۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب کی بعد ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط پوری طرح قائم ہو گیا اور ہم کو ان کی ہر چیز اچھی معلوم ہونے لگی، تو آن کے لٹریچر سے بھی متاثر ہوئے اور اسی کے تتبع میں حالی، آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے غزل سے ہٹ کر ایک مستقل راہ نظم نگاری کی قایم کی، جو فنی حیثیت سے تو نئی نہ تھی، لیکن ذہنی اعتبار سے وہ یقیناً غزل سے بالکل جدا چیز تھی۔

یہ نظمیں یا تو یکسر اخلاقی و مذہبی حیثیت رکھتی تھیں یا محض نقاشانہ۔ ان میں

سیاست کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔ اس کے بعد جب ملک میں آزادی کا کچھ احساس
پیدا ہونے لگا تو مضمون میں قومی و سیاسی جذبات کو بھی جگہ ملنے لگی اور اس رنگ
کی شاعری میں سب سے زیادہ کامیابی اقبال نے حاصل کی۔

اقبال کا دورِ شاعری نظم نگاری کے لحاظ سے یقیناً بڑا انقلابی دور تھا
جس نے بہت سے خوش فکر نظم نگار ملک میں پیدا کئے لیکن یہ انقلاب صرف
خیالات و جذبات تک محدود تھا، شاعرانہ ٹکنک بدستور وہی چلا آتا تھا اور فنی
قیود کو توڑ دینے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

اسی زمانے میں جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان نے اس میں نمایاں حصہ لیا
اس امید پر کہ جنگ کے بعد وہ آزادی سے قریب تر ہو جائے گا۔ لیکن جب یہ خیال
پورا نہ ہوا تو سیاسی ہیجان بہت بڑھ گیا۔ اور بالشیوک روس کے حالات سے متاثر
ہو کر "سماج" "اقتصاد اور مزدور" کا ایک اجتماعی تصور ہمارے ذہنوں میں
کام کرنے لگا۔

اس کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا اور قومی و سیاسی نظموں میں ایک نوع
کی اشتراکی تبلیغ بھی نظر آنے لگی، لیکن یہ آواز ایک بھنبھناہٹ سے زیادہ نہ
تھی کیونکہ ملک اور بہت سی اندرونی الجھنوں میں مبتلا تھا اور اجتماعی حیثیت
سے کوئی صحیح راہِ عمل متعین نہ ہو سکتی تھی۔

البتہ بنگال میں نذر الاسلام ایک ایسا شاعر ضرور تھا جو کھلی ہوئی باغیانہ
نظمیں لکھتا تھا اور لوگوں کو انقلاب کی دعوت دیتا تھا۔ اس کا اثر سب سے پہلے
جوشؔ نے قبول کیا اور ان کی نظموں میں نذر الاسلام کے خیالات کی جھلک نظر
آنے لگی۔ بعد کو رفتہ رفتہ اور نوجوانوں میں بھی اسی قسم کی شاعری کا میلان پیدا
ہوا۔ یہ بھی ابتدا سیاسی اور قومی نظموں میں زاویۂ نگاہ کے بدلنے کی اور یہ تھا آغاز

اس دور کا جس نے ہمارے ادب میں مزدور، کسان، اور روٹی کو بھی شامل کیا لیکن نظم کی ٹکنک تقریباً وہی رہی اور ردیف و قافیہ، وزن و بحر کی پابندی سے انحراف نہیں کیا گیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ شعروں اور مصرعوں کی تقسیم میں زیادہ آزادی سے کام لیا گیا اور نظموں کی ہیئت ظاہری مخمس، مسدس وغیرہ کی سی نہ رہی بلکہ کچھ اور ہو گئی۔ ہر چند مسلسل نظموں کے وہ وقفے جو مسدس یا مخمس وغیرہ میں ٹیپ کے اشعار یا مصرعوں سے متعین کئے جاتے ہیں اور جن کے مخصوص آہنگ سے ہمارے اذہان آشنا ہو چکے تھے، اب بدلنے لگے اور وقفوں کے اصول کو بڑی حد تک توڑ دیا گیا، تاہم بحر و وزن رہنے کی وجہ سے اس میں ترنم بدستور قایم رہا، یہاں تک کہ زمزمہ رفتہ رفتہ نئے ادب کا نام ہمارے کانوں میں پڑنے لگا۔

"نیا ادب" کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا؟ یہ مسئلہ طویل بحث کا محتاج ہے لیکن تاریخی حیثیت سے اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اس کی ابتدا ایک کتاب "انگارے" کی اشاعت سے ہوتی ہے۔ یہ کتاب نثر کے مضامین کا مجموعہ تھی اور اس میں بعض سماجی مسائل پر حد درجہ بیباکی اور نہایت سخت طنزیاتی لہجہ میں اظہار خیال کیا گیا تھا۔ اس پر ملک کے قدامت پسند طبقہ میں بڑی شورش پیدا ہوئی، یہاں تک کہ حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ اس ہنگامے سے ادب جدید کے حامیوں کو اندازہ ہو گیا کہ "حقیقت نگاری" کا وہ اسلوب جو "انگارے" میں اختیار کیا گیا تھا، ابھی قبل از وقت ہے چنانچہ جب (غالباً ۱۹۳۶ء میں) ترقی پسند مصنفین کی انجمن قایم ہوئی تو انھوں نے اپنے لائحہ عمل میں اس کا خیال رکھا اور "انگارے" کے قسم کی کوئی چیز پیش کرنے کی جرأت انھوں نے نہیں کی۔

"انگارے" میں جو مضامین پیش کئے گئے وہ ادبی یا حقیقت نگارانہ حیثیت سے اچھے تھے یا برے، یہ بحث علیحدہ ہے لیکن اس کی اشاعت کے بعد "قدیم و

جدید، میں جو تصادم ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ "نئے ادب" یا "ترقی پسند ادب" نے جڑ پکڑ لی اور رفتہ رفتہ اس میں برگ و بار "اب نظم معرّا اور نظم آزاد کہلاتے ہیں

اس سلسلہ میں ہم کو کئی باتوں پر غور کرنا ہے، ایک یہ کہ اس قسم کی شاعری کا مقصد واقعی کوئی ہے یا نہیں، —— دوسرے یہ کہ یہ مقصد کیا نظم آزاد کے سوا کسی اور ذریعہ سے پورا نہیں ہو سکتا چونکہ موجودہ آزاد شاعری "نئے ادب" کی پیداوار ہے، اس لئے ہم کو نئے ادب کے مقاصد ہی ہیں اس کی جستجو کرنا چاہیے اس گروہ کی طرف سے جتنے مقالے اس وقت تک شائع ہوئے ہیں، ان سب میں نئے ادب کا مقصد ایک ہی ظاہر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ "ہر زمانے کا ادب اپنے سماجی ماحول کا آئینہ ہے اور ادب کو زندگی کے مسائل سے بحث کرنا چاہیئے"

اس مقصد کی بلندی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی قوم کا "ادب" واقعی اس کے "اجتماعی مسائل" کو نہیں سلجھاتا، تو یقیناً وہ کوئی اجتماعی اہمیت نہیں رکھتا اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہر زمانہ کی سماجی ضروریات کے لحاظ سے ادب میں بھی تبدیلیاں پیدا ہونا ضروری ہیں، لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ ان تبدیلیوں کی نوعیت کیا ہونا چاہیے۔ یعنی یہ تبدیلیاں محض تبدیلی کے لئے ہونا چاہیئے یا ان سے کوئی مفاد بھی متعلق ہونا چاہیئے۔ اگر "ادب برائے زندگی" کا مقولہ کوئی صداقت رکھتا ہے تو پھر یہ تبدیلی بھی برائے زندگی ہونا چاہیئے، نہ کہ برائے "تبدیلی"

ممکن ہے کہ قدامت پرست شعراء کے یہاں یہ "غیر افادی" عنصر پایا جائے، لیکن دعوائے تجدد کرنے والوں کے لئے بڑے شرم کی بات ہوگی، اگر وہ ادبی تبدیلیوں کی کوئی حقیقی، ٹھوس وجہ نہ پیش کر سکیں۔

اس سلسلہ میں آئیے سب سے پہلے نئی اور پرانی شاعری کے فرق کو دیکھیں جس حد تک ادب کا تعلق ہے خواہ وہ نظم ہو یا نثر، صرف اس کا داخلی یا معنوی پہلو

قابل غور ہے اور اسی کی تبدیلی سے ادب میں تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے اور اگر داخلی پہلو کے ساتھ اس کے خارجی پہلو میں بھی کوئی تبدیلی پیدا کی جاتی ہے تو اس کا سبب متعین کرنا ہوگا۔ فرض کیجیئے کہ ایک شخص اپنے آپ کو غزل کا مخالف کہتا ہے اور آزاد شاعری کا حامی ہے، لیکن جذبات کے لحاظ سے اس کی شاعری یکسر تغزل ہے، تو ہم اس کو غزل کا مخالف نہ کہیں گے بلکہ صرف ردیف وقافیہ کی پابندی کا مخالف کہیں گے اور اس کی یہ مخالفت بالکل بے معنی ہوگی کیونکہ ردیف وقافیہ ترک کرنے کے بعد بھی اس کی شاعری میں کوئی داخلی یا معنوی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے نئے اور پرانے ادب کا فرق ہم کو سب سے پہلے معنوی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔

اس وقت غزل ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ اس پر بحث کرنے کی ضرورت، کیونکہ نہ غزل گو شعراء نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ وہ سماج یا قوم کے لئے غزلیں کہتے ہیں اور نہ واقعی غزل کا یہ مقصود ہے، بلکہ گفتگو اُن معرّا و آزاد نظموں سے ہے جن کو ہماری زندگیاں سدھارنے یا ملک کو آزاد کرانے یا بدرجۂ اقل حقوقِ انسانیت تسلیم کرانے کے لئے لکھا جاتا ہے اور اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر ہمیں ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن کیا ان معرّا اور آزاد نظموں میں سے کوئی ایک نظم ایسی پیش کی جاسکتی ہے جس نے سماج کی کوئی خدمت انجام دی ہو یا دے سکتی ہو۔ اس اشاعت میں "آزاد گو" اسکول کے بڑے بڑے نامور شعرا کا کلام آپ کو نظر آئے گا، اسے پڑھیئے اور بتائیے کہ ان میں کونسی اس خصوصیت کی حامل ہے۔ ایک صاحب آزاد شاعری کی نمایندگی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"آزاد نظم نئی چیز نہیں بلکہ اب سے بہت پہلے ۱۹۱۳ء میں انگلستان و امریکہ کے بعض شعراء نے اس کی ابتدا کی تھی ان شعراء کا مقصود یہ تھا کہ

شاعری میں عام زبان استعمال کی جائے جو زیبائش و آرائش سے پاک ہو اور جس میں "مبہم عمومیات" سے گریز کیا جائے"

اول تو یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ چونکہ انگلستان و امریکہ میں نظم آزاد کا رواج پایا جاتا ہے، اس لئے ہندوستان میں بھی اس کو رائج ہونا چاہئے۔ ہر ملک کا ادب اس ملک کے روایتی، جغرافیائی، تاریخی، اخلاقی و معاشرتی ماحول کی پیداوار ہوا کرتا ہے اور یہ ماحول مشرق و مغرب میں بالکل مختلف ہے اور مختلف رہے گا اس لئے اس باب میں تتبع و تقلید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان نے آپس کے میل جول سے اس اثر کو قبول کیا، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف آپ اپنے کو یورپ کی غلامی سے آزاد بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف آپ اس پر بھی ناز فرما رہے ہیں کہ آپ کا لٹریچر مغربی خصوصیات سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ لیکن خیر اس کو بھی جانے دیجئے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتے ہیں کہ یہ تتبع واقعی قابلِ فخر و ناز ہے مگر کیا آپ مغرب کی آزاد نظم نگاری کا واقعی صحیح تتبع کر رہے ہیں؟

وہ تو یہ کہتے ہیں کہ اس نوع کی شاعری میں عام زبان استعمال ہونا چاہئے جو زیبائش و آرائش سے پاک ہو اور جس میں مبہم باتوں سے گریز کیا جائے، لیکن افسوس ہے کہ آپ کے یہاں ان میں سے کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ نہ زبان عام، نہ تصنع سے احتراز اور نہ "مبہمات" کی کمی۔

صاحبِ مضمون نے ایک جگہ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "آزاد نظم کا بیج بونے والے قدیم طرز کی شاعری کو جس میں حقیقت نگاری کا عنصر زیادہ غالب تھا نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ شاعری پست تھی جس میں سیدھے سادے انداز سے اظہارِ خیال کیا جائے اور جس میں "اشاریت" نہ ہو ——"

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم طرز کی شاعری کو محض اس کی حقیقت نگاری اور سادگی بیان کی وجہ سے ناپسند کیا جاتا تھا حالانکہ ترقی پسند ادب شاعری کا اولین نصب العین "حقیقت نگاری" ہی ہے اور سادہ و عام زبان کا استعمال بہر حال صاحب مضمون نے جو دلائل بیان کئے ہیں اُن میں تضاد پایا جاتا ہے اور وہ کوئی علمی یا ریخی توجیہہ "آزاد نظم نگاری" کی حمایت میں پیش نہیں کر سکے۔

"ابہام اور اشاریت" آزاد نظم کی خصوصیت خاصہ ہے، اور یہ غالباً زار کے زمانے کے روسی ادب سے لی گئی ہے جب خوف کی وجہ سے کھل کر بات نہ کہی جا سکتی تھی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسیات کو دیکھتے ہوئے یہ "اشاریت" ایک حد تک مناسب ہو (حالانکہ اب بظاہر اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی) لیکن صرف "سیاسیات" کی حد تک۔ مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ اس وقت تک جتنے مجموعے ان ترقی پسند شعراء کے شائع ہوئے ہیں، اُن میں "سیاست" کا موضوع اتنا زیادہ نہیں ہے، لیکن ابہام و اشاریت ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

شاعری میں ہلکا ہلکا ابہام یقیناً بڑی لطف کی چیز ہے، لیکن ابہام اور اہمال کی سرحدیں اتنی قریب قریب ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے لئے بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جس حد تک جذبات کی آزادی کا تعلق ہے، وہ بھی "فحش گوئی" سے علیحدہ ایک چیز ہے جس کا نام "حقیقت نگاری" و "صداقت نگاری" تو ہو سکتا ہے لیکن "فحاشی" نہیں!

ہم سمجھتے ہیں کہ "آزاد نظم نگاری" سے اگر کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے تو زیادہ تر اس کی داخلی کیفیت سے اور اس کی اس معیوب خصوصیت نے اس کی "خارجیت" کو بھی بد نما بنا دیا ہے۔

آزادی کا جذبہ انسان میں بڑی اچھی چیز ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "آزادی"

ہی کو سب سے زیادہ "پابندی" کی ضرورت ہے، ورنہ اس تلوار سے انسان خود
اپنے ہی آپ کو زخمی کر لیتا ہے، اگر ادب سماج کی اصلاح کے لئے ہے جیسا کہ ترقی
پسند ادیبوں کا دعویٰ ہے تو اس کو سماج کی ضروریات اور اس کے مصالح کا پابند
رہنا پڑے گا، اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں "کھل کھیلنے" یا "فحاشی" کا کوئی موقع
نہیں۔

جنسی جذبات کی "پیداوار" کوئی نئی چیز نہیں، انسان ہمیشہ اس کے لئے تڑپا
ہے، اسی جذبہ کی آزادی نے قوموں میں کشت و خون کا بازار گرم کیا اور اسی جذبہ کی
پابندی کی طرف سب سے پہلے سوسائٹی نے توجہ کی، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جس جذبہ
کا کھلم کھلا عمل میں لانا معیوب ہو، اس کا اظہار مستحسن سمجھا جائے۔ لیکن اگر اس طرح
بیباکی سے اس کا اظہار کیا جاتا ہے تو پھر اس کو علی الاعلان عمل سے بھی ظاہر کرنے
کی جرأت کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لئے بھی تیار ہوں، لیکن جب تک
حکومت کا قانون انھیں اس حرکت سے باز رکھتا ہے، اس کا اظہار آزادی نہیں
بلکہ حد درجہ کمزوری اور ذلیل غلامانہ ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے۔

ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے جو ترقی پسند جماعت کے نہایت سربرآوردہ رکن
ہیں اکتوبر و نومبر کے رسالہ منزل میں ترقی پسند ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار
کیا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔

"انھوں نے لکھا ہے کہ "ترقی پسند ادب وہی ہے جو زندگی کے حقیقی مسائل
سے بحث کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب کے ابتدائی دور میں انقلاب، مزدور،
کسان اور طبقاتی کشمکش کے عنوانات پر نظمیں اور افسانے لکھے گئے، بعض
کامیاب و موثر تھے اور بعض کو محض نیت کا ثواب ملا، لیکن جب سے موجودہ
جنگ شروع ہوئی بیشتر ترقی پسند شاعر اور افسانہ نویس خاموش ہو گئے اس

لئے کہ موجودہ حالات میں ان کو صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ طبیعتوں میں ہیجان پیدا ہوتا ہے تو رومانی نظمیں یا غزلیں لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں یا "ارباب[1] وطن کی بے بسی کا انتقام" لینے کی کوئی اور ترکیب دریافت کر لیتے ہیں۔ اگر ہمارے بیشتر شاعروں کی ترقی پسندی محض سطحی اور ذہنی نہ ہوتی بلکہ ان کے جذبات اور فطری احساسات کا جزو ہوتی تو ان کو آج کل ہزاروں ایسے نئے عنوانات ملتے جن پر ادبی شہپارے تیار ہو سکتے تھے۔ شاعر یا آرٹسٹ تو اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک اس کے جذبات و احساسات پر ایک خاص کیفیت نہ طاری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال کے ادیب آج کل کے اصلی مسائل کو دوسرے صوبوں کے ادیبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ محسوس کرتے ہیں اور وہاں کا ادب آج کل بھی صحیح معنوں میں ترقی پسند ہے لیکن اس توجیہ سے دوسرے صوبوں کے ترقی پسند ادیبوں کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک زمانے میں انھوں نے ترقی پسند ادب پیش کیا اور ان پر ترقی پسندی کا ٹھپا تو لگ گیا لیکن اگر اس عالمگیر کشمکش کے دور میں بھی وہ اپنے پرانے راگ کو الاپتے رہے یا زندگی کی کشاکش سے بھاگ کر وہ بھی "ہاتھی دانت کے مینار" میں پناہ گزیں ہو گئے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اپنے ساتھ ساتھ وہ ترقی پسند ادب کو بھی بدنام کریں گے اس لئے کہ زمانہ یہ فیصلہ تو دیر میں کرے گا کہ فلاں ادیب اب ترقی پسند نہیں رہا ہے۔ پہلے تو لوگ یہی کہیں گے کہ دیکھئے یہ ہیں ترقی پسند ادب کے نمونے۔ چنانچہ آج کل یہی ہو رہا ہے۔ خود وہ ادیب جو ایک زمانہ میں واقعی ترقی پسند تھے اب ایسا ادب پیش کر رہے ہیں جس سے مخالفوں اور رجعت پسندوں کو اچھا موقع مل گیا ہے۔"

[1] غالباً اشارہ ہے۔ ن۔ م۔ راشد کی نظم "انتقام" کی طرف۔ (مرتب)

ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے اس بیان سے واضح ہے کہ وہ ایسے شاعروں کو جو فاحش و عریاں نظمیں لکھتے ہیں، ترقی پسند ادیب یا شاعر نہیں سمجھتے اور ان کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے، کیونکہ ترقی پسندی کا فرض صرف سماج اور ہیئت اجتماعی کے داعیات کو پیش کرنا ہے جو ان نظموں سے پورا نہیں ہوتا۔

اس نوع کے عریاں نظم نگاروں کی طرف سے ایک الزامی جواب یہ پیش کیا جاتا ہے کہ کیا اساتذۂ قدیم میر وغیرہ کے یہاں فحاشی نہیں ہے اور خصوصیت کے ساتھ مثنویوں کا تو اکثر حصہ حد درجہ عریاں ہے، یہ بالکل درست ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس دلیل سے وہ اپنی فحش نگاری کو کیونکر جائز قرار دے سکتے ہیں جبکہ اساتذہ قدیم کے اس قسم کے کلام کو ہمیشہ ناپسند کیا گیا۔ علاوہ اس کے ترقی پسندی کا اقتضا یہ ہونا چاہیئے کہ وہ "قدامت پسندی" کے معائب کو ترک کریں، نہ کہ ان کو اپنے لئے دلیل راہ بنائیں۔

جدید شاعری میں عریاں نظموں کے علاوہ "اشتراکیت" کی تبلیغ کرنے والی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ جن میں مزدور، کسان وغیرہ کی نمایندگی کی گئی ہے اور حکومت و سرمایہ داری کے خلاف اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یقیناً ایسی نظمیں سماج کے معاملات سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن چونکہ ان کے کہنے والے اکثر صحیح جذبۂ آزادی سے محروم ہیں اس لئے ان کی نظمیں خلوص و صداقت سے معرا ہیں اور محض ایک غیر کمرداراز گفتار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

الغرض داخلی و معنوی حیثیت سے عہد حاضر کی آزاد شاعری بالکل "تہی دست" ہے، رہ گئی اس کی خارجی حیثیت سو اس میں ہمارے نزدیک معائب کے ساتھ یقیناً بعض محاسن بھی ہیں۔

معائب تو یہ ہیں کہ الفاظ و محاورات کے صحیح استعمال اور ترکیبوں کی چست

بندش کی طرف اس میں بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور محاسن یہ ہیں کہ اس کا اسلوب بیان یقیناً دلکش ہے اور جب نئے نئے زاویوں سے اظہار خیال کی کوشش کی جاتی ہے تو اُن میں کافی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک اچھے ذوق کا شاعر اس میں کافی وسعت پیدا کر سکتا ہے۔ رہا سوال وزن و قافیہ کا سو وہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "بے لگامی" بعض شعراء کے یہاں "بد لگامی" کی حد تک پہونچ جاتی ہے اور کسی قسم کا "لحن و آہنگ" اس میں پیدا نہیں ہوتا۔

ترکی نے بھی انقلاب کے بعد قدیم عروض کو ترک کر کے ایک جدید عروض وضع کیا ہے جسے وہ "عروض ملی" کہتے ہیں، لیکن چونکہ آہنگ کے لحاظ سے شعر کو موسیقی سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے یہاں کی موسیقی کو بھی بدل کر اس کے ایقاعات (تال) بالکل مغربی موسیقی کے انداز پر قائم کئے ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے آزاد نظم نگاری کو گوارا نہیں کیا اور معرّیٰ نظمیں بھی کم لکھی جاتی ہیں۔

ایران کی کلاسکل شاعری تو عرصہ ہوا ختم ہو گئی تھی، لیکن جدید رجحانات کا مستقل اسلوب رضا شاہ کے زمانے میں پیدا ہوا اور اب وہاں بھی معنوی و داخلی حیثیت سے ہیئت اجتماعی کے مسائل کو سامنے رکھ کر شاعری کی جاتی ہے۔ لیکن وہاں اور یہاں کی شاعری میں بہت فرق ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں صداقت کا جوش خلوص کی قوت اور عمل کا ولولہ پنہاں ہوتا ہے، لیکن یہاں کی جدید شاعری کی حیثیت بھی بالکل روایتی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ یعنی وہ مزدور و کسان کی حمایت کرنے میں صرف اس لئے کہ روسی ادب میں اسی کا رواج ہے، وہ سرمایہ دار کی مخالفت کرتے ہیں، محض اس بنا پر کہ بغیر اس مظاہرے کے جذبۂ آزادی کی نمایش نہیں ہو سکتی، خود اُن کے دل میں کوئی صحیح جذبہ آزادی، یا مزدور و کسان کی حمایت کا نہیں پایا جاتا، چنانچہ ہم کو بعض ایسے انقلاب پسند شعراء کا حال معلوم ہے، جو سرمایہ داروں کے سامنے دستِ سوال دراز

کرتے ہیں اور اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ یہ خراج تھا جو سرمایہ داروں سے وصول کیا گیا

بہرحال ہمارے یہاں کے اکثر ترقی پسند شعراء و ادیب کیفیت و صداقت کے لحاظ سے نہ اشتراکیت پسند ہیں نہ انقلابی، نہ انھیں سماج سے کوئی واسطہ ہے، نہ قوم وملت سے۔ وہ روس اور روسی ادب کا ذکر بار بار کرتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت بالکل ویسی ہی ہے جیسے "پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بتا دیا"! وہ یوں تو مارکس اور لینن کو پیغمبری کا درجہ تک دینے کے لئے تیار ہیں، لیکن اگر مارکس و لینن کے ان امتیوں سے دریافت کیا جائے کہ ان کے پیغمبروں کی صحیح تعلیم و تلقین کیا ہے تو ان میں سے غالباً اکثر اس کا جواب نہ دے سکیں گے۔

علاوہ مارکس کے ایک اور شخص کا نام بھی ترقی پسند جماعت کی طرف سے لیا جاتا ہے اور وہ فرائڈ ہے۔ مارکس کا علم تو اب اکثر لوگوں کو ہو گیا ہے کیونکہ ہمارے شعراء کے یہاں جو جنسی بھوک کا بار بار ذکر آتا ہے وہ مارکس ہی کا تصرف ہے، لیکن فرائڈ شاید نئی چیز ہے اس لئے پہلے اس کے نظریہ کو سمجھ لیجئے۔

وہ کہتا ہے کہ انسان کا سب سے قوی جذبہ، جنسی جذبہ ہے یعنی وہ جذبہ جو مرد کو عورت کی طرف کی اور عورت کو مرد کی طرف مائل کرتا ہے، اس کا خیال ہے کہ ایک انسان کی تمام عملی زندگی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس الجھن کو دور کرنے کی فکر کی جائے اور سوسائٹی کا کوئی ایسا نظام بنایا جائے جو ان الجھنوں کو نہ پیدا ہونے دے۔

یہ نظریہ اپنی جگہ صحیح ہے یا غلط ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان ادیبوں نے جس جدید ادب کی بنیاد ڈالی ہے، کیا وہ اس قسم کی الجھنوں کو دور کر سکتا ہے؟ —— آج کل کے انقلاب پسند افسانہ نگاروں اور شاعروں کا سرمایۂ ادب و شعر ملاحظہ کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ الجھن دور کرنا کیا

معنی، خود اس کی بنیاد الجھن پر قایم ہے ــــ معنوی و لفظی دونوں قسم کی الجھن ــــ
یعنی اول تو آپ کے لئے الفاظ سے کوئی معنی پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا اور اگر آپ کسی
نہ کسی طرح بہت سے محذوفات فرض کر لینے کے بعد اس میں کامیاب ہوئے بھی تو نتیجہ معلوم!

اس کا نام ان حضرات نے "ابہام و اشاریت" رکھا ہے، اور چونکہ آج کل مغرب
میں "Futurist" طبقہ کے آرٹ کو بعض ادیبوں اور نقاشوں نے یکسر ابہام
(یا یوں کہئے اہمال) بنا رکھا ہے، اس لئے یہ لوگ بھی ان کی تقلید و تتبع میں اس کو اختیار
کرتے جاتے ہیں اور اس کا نام انھوں نے "Ultra-Modern" رکھا ہے

شاعری میں ابہام یقیناً لطف دیتا ہے اور اشارت و کنایت کی گفتگو زیادہ دلچسپ
ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ابہام میں کوئی (Suggestive)
کیفیت پائی جائے، اور یہاں یہ حال ہے کہ جس چیز کو وہ اشاریت (Suggestiveness)
سے تعبیر کرتے ہیں خود اس میں بھی ابہام ہے۔

ہماری قدیم شاعری میں بھی ابہام، تلمیح، اشاریت و کنایت سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ لیکن
نہ انھوں نے لغت میں کوئی تصرف کیا اور نہ وہ بیان و معانی کے مقررہ اصولوں سے ہٹے
آپ خواہ کتنی ہی آزادی سے کام لیں۔ لیکن ٹکنک کے لحاظ سے شاعری کو بہرحال کسی
نہ کسی اصول کا پابند رکھنا ہی پڑے گا اور یہی پابندی نظم و نثر کے درمیان وجہ امتیاز بھی
جائے گی محض چند الفاظ کے مجموعہ کا نام تو شاعری نہیں۔

نئی شاعری کے متعلق ایک اور شکایت یہ بھی ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ــــ
"عریاں" ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں نئی شاعری اتنی قابلِ الزام نہیں، جتنے
نئے شاعر۔ میں نہیں سمجھتا کہ نئی شاعری، خواہ فرائڈ کے نظریہ کو کتنا ہی غلط سمجھا گیا ہو، عریانی
و فحاشی کی طرفدار ہو سکتی ہے، البتہ بعض نئے شاعر ضرور ایسے ہیں، جو صرف فحش گوئی
کو حقیقت نگاری کہتے ہیں اور شاید غلطی سے وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ فرائڈ کی بتائی ہوئی جنسی

الجھن" اسی طرح دور ہو سکتی ہے۔

آپ اسی کتاب میں اس قسم کی بعض نظمیں ملاحظہ فرمائیں گے جن کو بطور حوالہ مقالہ نگاروں نے نقل کیا ہے، انھیں پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا ان میں سوائے ایک وقتی کیفیت و ناآسودہ ہیجان کے کچھ اور پایا جاتا ہے اور کیا فرائڈ کے نظریہ کا مطالبہ اسی طرح پورا ہو سکتا ہے۔ رہا آرٹ سو اس میں بھی ایسی نظمیں کوئی دلکش اضافہ نہیں کرتیں۔

جدید شاعری کی جدت کی وہ مثالیں جن میں "جنسیات" سے ہٹ کر فکر کی گئی ہے یقیناً قابلِ توجہ ہیں اور ہم کو ان میں بعض ایسے پہلو بھی نظر آتے ہیں، جو واقعی لطیف و دلکش ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض اس لئے ساقط الاعتبار ہیں کہ موضوع کے لحاظ سے مناسب زبان ان کو نصیب نہیں ہوئی اور بعض اس لئے قابلِ توجہ نہیں کہ تسلسل خیال قائم نہ رہنے کی وجہ سے کوئی مرکزی چیز ان میں پیدا نہ ہو سکی۔

ادب کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اس کی اثر انگیزی ہے، اگر ہم کوئی بات کہہ کر کسی کو متاثر نہیں کر سکتے تو وہ ادب سے خارج سمجھی جائے گی۔ اور ادب کی اثر انگیزی کے لئے مخصوص شرائط ہوا کرتے ہیں۔

سب سے پہلی چیز موضوع ہے، یعنی جس مسئلہ پر ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ خود بھی توجہ کے قابل ہے یا نہیں؛ اس کے بعد غایت کی تعیین ہے۔ یعنی ہم کیا بات کس نتیجہ کے ساتھ ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں، اور تیسری چیز اسلوب بیان ہے۔ جدید شاعری میں ہم کو ان تینوں چیزوں کی کمی نظر آتی ہے۔ سوائے مزدور، بھوک اور کسان کے ہم کو اور کوئی موضوع ایسا نظر نہیں آتا جس پر اس سے قبل بارہا اظہارِ خیال نہ کیا گیا ہو، رہا مقصد، سو وہ اس لئے گم ہے کہ اس کا تعلق اسلوب بیان سے ہے اور وہ عام طور پر اتنا الجھا ہوا ہوتا ہے کہ سننے والے کو اس کے سلجھانے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔

حیرت ہے کہ ایک طرف تو جدید شاعری کو سماج کی شاعری پبلک کی شاعری اور مزدور و کسان کی شاعری کہا جاتا ہے اور دوسری طرف اس کے اشکال کا یہ عالم ہے کہ عوام کیا خواص بھی اس کے سمجھنے سے معذور رہتے ہیں۔

نظم میں علاوہ مفہوم کے ایک چیز اور بھی ہوتی ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ اس کی موسیقیت ہے لیکن چونکہ موسیقیت کا تعلق زیادہ تر وزن و قافیہ سے ہے اس لئے آزاد شاعری اس پہلو سے بھی کمزور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ردیف و قافیہ کی موسیقیت کی کمی انھوں نے لحن Cadence سے دور کیا ہے۔ اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ جس وقت نظم پڑھی جاتی ہے تو اس میں خاص قسم کی روانی ہوتی ہے جو ایک طرح کا توازن بھی رکھتی ہے۔

یہ ایک حد تک درست ہے، لیکن چونکہ آزاد شاعری میں وزن کی پابندی بھی اصول سے آزاد ہے، اس لئے ایک ہی نظم میں وزن کی کمی بیشی سے ہمارے احساس توازن کو چوٹ پہنچتی ہے اور اس نظم کی حیثیت ایک ایسے نقش کی سی ہو جاتی ہے، جس میں رنگ تو اچھا ہے لیکن پھول پتیوں کے تناسب کا خیال نہیں رکھا گیا۔

اس میں کلام نہیں کہ نظم معریٰ لکھنا آسان ہے اور آزاد نظم نگاری اس سے زیادہ آسان اور یہ اس کی مقبولیت کے لئے کافی وجہ ہو سکتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو پابندی کی شاعری نہیں کر سکتا "آزاد اسکول" کے شاعروں میں آسانی سے شامل ہو سکتا ہے لیکن کیا آرٹ اس قدر "سستا اور آسان" ہو جانے کے بعد آرٹ رہ سکتا ہے؟ آرٹ کی ترقی جانچنے کا معیار یہ نہیں کہ وہ ہر جگہ آسانی سے مہیا ہو سکتا ہے، بلکہ صرف یہ کہ اسے کن دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے اور شعر میں یہ دشواریاں داخلی و خارجی دونوں ہوا کرتی ہیں۔

ہر زمانہ میں لٹریچر کی خوبی یہی پائی گئی ہے کہ وہ صاف و دلنشیں ہو اور ذہن انسانی

آسانی سے اس کے مفہوم واثر کو قبول کر سکے کیونکہ اسی صورت میں مصنف کا مقصود پورا ہو سکتا ہے، لیکن عہد حاضر کی آزاد شاعری ذہنی ورزش تو ضرور ہے لیکن ذہنی سکون و آسودگی نہیں۔

یقیناً غزل گوئی کا وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے، جب شعر کا مقصود تفریح کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اب شاعر کو زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں بھی حصہ لینا چاہئے، لیکن اگر وہ گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں خود "ناقابلِ فہم" چیز بن جائے تو اس کی شاعری سے کسی کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ سماج کی ضروریات، تمدن کی ترقی، علوم و فنون کی وسعت کا اثر شاعری پر پڑنا چاہئے اور اگر کسی قوم کی شاعری زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی، تو وہ بے شک بیکار چیز ہے، لیکن زمانے کا ساتھ دینے کا مفہوم یہ تو نہیں ہے کہ وہ معما و چیستان ہو کر رہ جائے۔

تشبیہوں کی جدت، استعاروں کی ندرت، اسلوب بیان کا تنوع، تخیل کی موشگافیاں، ہمیشہ قابل قدر سمجھی گئی ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ یقیناً ان میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہئے، لیکن قومی مزاج سے علیحدہ ہو کر ان میں ترقی کی راہیں پیدا کرنا نہ مفید ہو سکتا ہے نہ درخورِ اعتنار!

آجکل کے بعض مشہور "آزاد گو" شعراء کی نظمیں جس وقت میں سنتا ہوں تو مجھے اس کا احساس تو یقیناً ہوتا ہے کہ وہ بہت ذہین ہیں، اُن میں بلکہ شعری بھی اچھا پایا جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ جب یہ محسوس کرتا ہوں کہ انھوں نے پرانی راہ صرف اس لئے چھوڑی ہے کہ وہ پرانی ہے اور نئی راہ محض اس خیال سے اختیار کی ہے کہ وہ نئی ہے تو افسوس ہوتا ہے، کیونکہ جس چیز کو انہوں نے قدیم سمجھ کر ترک کیا ہے، اس میں اب بھی خدا جانے کتنی چیزیں ایسی ہیں جو اس جدت پسندی کے دور میں بھی "جدید تر" ہیں اور جس جدت کو وہ "جدید" کہتے ہیں اس میں کوئی لذت

نہیں۔ نظم نگاری میں یقیناً بہت سے نئے اسلوب پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے لئے وسیع مطالعہ، پاکیزہ ذوق اور حددرجہ معتدل قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہے، اور ظاہر ہے کہ ہر شخص میں یہ تمام باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

جس حد تک مطالعہ کا تعلق ہے، وہ صرف مغرب و پیداوارِ مغرب تک محدود ہونا چاہیئے، بلکہ مشرقی لٹریچر تک اس کے وسیع ہونے کی ضرورت ہے اور سب سے بڑی کمی آج کل کے نوجوانوں میں یہی ہے، پاکیزہ ذوق فطرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور کسب واکتساب کو اس میں دخل نہیں اس لیئے اس کا کوئی معیار مقرر نہیں ہو سکتا، تاہم یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ادب کا کوئی معیاری پہلو، اخلاق و تہذیب سے جدا نہیں ہو سکتا اور آرٹ خواہ آرٹ کے لیئے ہو یا زندگی کے لئے کسی نہ کسی وقت اس کو حیاتِ انسانی کے نقطۂ نظر کا پابند ہونا ہی پڑتا ہے۔ رہی قوتِ فیصلہ سو اس کے لئے مشق و تجربہ کی ضرورت ہے اور ہو سکتا ہے کہ جو نوجوان آج کل ضرورت سے زیادہ بے باک نظر آتے ہیں، وہ پختگیٔ عمر و مشقِ سخن کے بعد اپنے ذوق میں مناسب اعتدال پیدا کر سکیں۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، جدید شاعری میں امکاناتِ ترقی کا ہر شخص معترف ہے اور اگر ردیف و قافیہ کی پابندی ترک کر دینے کے بعد ہی ترقی کی راہیں پیدا ہو سکتی ہیں، تو اسے بھی گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن با ایں ہمہ، جدید شاعری کا کوئی نہ کوئی مقصود متعین کرنا پڑے گا اور اس مقصد کے حصول کے لئے خارجی حیثیت سے بھی کوئی نہ کوئی معیار مقرر کرنا ہوگا۔

نیا ادب میری نظر میں

وقار عظیم

نیا ادب، جس میں نثر بھی شامل ہے اور نظم بھی (اور کچھ ایسی چیزیں بھی جو ایک "تیسری صنف" سے تعلق رکھتی ہیں) آج کل ایک بدنام چیز کا نام ہے۔ بدنام اور بدنام سے زیادہ مشتبہ۔ اردو پڑھنے والوں کا ایک خاصا حلقہ اس کے تصور سے بھی گھبراتا ہے، اور ایک خاصا حلقہ ایسا ہے جو اس نام کے تصور سے چٹخارے لیتا ہے۔ پھر ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس نام کو اپنے تخیل کی رنگینی اور آزادی کی معراج سمجھتا ہے۔ کچھ لوگ اسے بدعت کہتے ہیں اور اُن کے خیال میں یہ بدعت ادب کو پستی کی طرف لئے جا رہی ہے، اور کچھ لوگوں کے نزدیک یہ بدعت، جدّت ہے، جو ادب کو سنوار رہی ہے اور میرے خیال میں یہ "بدعت" اور "جدت" "عالم الفاظ" کی ایک "غلط فہمی" ہے۔ دونوں میں افراط تفریط ہے، غیر ضروری مدح سرائی اور نازیبا ہجوگوئی۔ ان دونوں چیزوں کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے قدروں کے غلط معیار بناکر، ان پر حد سے زیادہ زور دینے اور ایک نے دوسرے کی بات سمجھے بغیر اسے منوانے کی کوشش کی ہے اور اپنی بات منوانے کی مسلسل کوشش میں عام طور پر ہٹ دھرمی کی رہبری ہوتی ہے۔

لیکن یہ "نیا ادب" جس کے پیچھے "قدروں" کی یہ جنگ ہو رہی ہے، ہے کونسا ادب؟ اس لئے کہ نیا یا نئی تو ایک اضافی لفظ ہے۔ جو کچھ کل نیا تھا وہ آج پُرانا ہو گیا، جو کچھ آج نیا ہے وہ کل پُرانا ہو کر رہیگا اور جو کچھ نیا ہوتا ہے وہ عموماً شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یہ بات نئی چیز پیش کرنے والے کے سلیقہ پر منحصر ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں اس نئی چیز کی صحیح قدروں کا صحیح احساس پیدا کر کے اُن کی ہمدردی اور اعانت حاصل کرے یا انھیں ہمیشہ کے لئے اس کی طرف سے بدظن بنا دے۔

نئی چیز۔ خواہ وہ ادب میں ہو، خواہ زندگی کے کسی اور شعبے میں، دو وجہوں سے پیدا ہوتی ہے۔ انسانی شعور چیزوں کو مدّتوں تک ایک ہی نہج پر دیکھتے دیکھتے اُکتا جاتا ہے اور وقت کی بڑھتی ہوئی رَو کے ساتھ

آگے بڑھنا رہنے کی خواہش اس میں پرانی چیزوں کو بدلکر نئی چیزیں بنانے اور پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ نئی ضرورتوں کا احساس، اور انہیں پورا کرنے کی کوشش فطرتِ انسانی کا یہ بالکل فطری اور ضروری عمل ہے۔ اس میں فرق آنا اور قانونِ فطرت میں خلل پڑنا، ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ اس لئے ہر زمانے میں انسانی شعور اور انسانی عمل نئی چیزیں پیدا کرتا ہے۔

نئی چیزیں ایک اور طرح بھی پیدا ہوتی ہیں۔ لوگوں کو خود ان کی ضرورت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ کسی اور کو دیکھ کر للچاتے ہیں اور محض نقالی میں وہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو چیزیں پہلے قسم کے فطری عمل سے پیدا ہوتی ہیں وہ قوم اور ملک کے مزاج کے لئے سازگار ہوتی ہیں اور جو چیزیں دوسری قسم کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں، قوم اور ملک کے مزاج پر گراں گذرتی ہیں۔ اور اس سے قوم اور ملک کے مزاج میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمارا نیا ادب جس سے میری مراد حالی اور آزاد کی شاعری، مہدی افادی اور سجاد علی کی نثر اور پطرس اور رشید کی مزاح نگاری نہیں، بلکہ کرشن چندر، بیدی یا عصمت کے افسانے یا راشد، فیض یا مجاز کی شاعری ہے (اور اس کے علاوہ نہ جانے کیا کیا کچھ جو نئے ادب کے نام سے لکھا جا رہا ہے)۔ انہیں دو تحریکوں کا نتیجہ ہے اور اس لئے اس کا کچھ حصّہ ایسا ہے جو زیادہ سے زیادہ تعریف کا مستحق ہے اور اس سے کہیں زیادہ حصّہ ایسا ہے جس کی زیادہ سے زیادہ برائی بھی کم ہے۔ اور ہم ادب کے ان دونوں حصوں کو "نیا ادب" کہتے ہیں۔

پرانے ادب کے ہوتے ہوئے ایک نئے ادب کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ جو ادب اب تک موجود تھا وہ آگے بڑھتی ہوئی زندگی سے پیچھے رہ گیا تھا اور اسی لئے ایک ایسے ادب کی تخلیق ضروری سمجھی گئی جو اس بڑھتی ہوئی زندگی سے ہم آہنگ ہو کر، اس کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چل سکے۔ اس کی مصور اور ترجمان بن کر

گویا' نیا ادب' اگر وہ واقعی فطرت کے اصول کی بنا پر پیدا ہوا ہے تو کبھی برا نہیں ہو سکتا
نئے تجربے' اگر ملک اور قوم کے تمدن' اس کی اجتماعی سیرت اور مزاج کو پیش نظر رکھ کر
کیئے جائیں تو شروع میں نہ سہی لیکن ایک نہ ایک منزل پر پہنچ کر وہ ہر نظر میں مستحسن بن جائیں
گے۔ یہی حال نقالی کا ہے۔ جو نقالی اپنی تمدنی خصوصیتوں کو سامنے رکھ کر کی جائے۔
یا جو نقالی' دوسرے کی اچھی چیزوں کو اپنی چیزوں میں اس طرح سمو سکے کہ اس سے اپنی
چیزوں کا حسن دوبالا ہو' وہ بھی بری نقالی نہیں۔ لیکن نئی ضرورت کا احساس ہو یا محض
نقالی کا جذبہ ہو' اگر یہ دونوں چیزیں ہمارے ادب میں ایسے عناصر شامل کر دینے پر
تل جائیں جن کی سہار ہمارے ادب کے لئے ممکن ہی نہ ہو سکے' جن کے سہارے چلنے
پر' ادب آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے کی طرف ہٹنے لگے' یا جن کی صحبت میں اس کے بلند اخلاقی
نظریے مجروح ہو ہو کر ختم ہوتے جائیں تو اس طرح کی کوشش کو نہ شروع میں سراہا جا سکتا
ہے اور نہ آخر میں۔

ہمارا' نیا ادب' کئی سال کی زندگی بسر کرنے کے بعد بھی ابھی تک ایک بحرانی دور
سے گذر رہا ہے۔ اس میں قدم قدم پر دونوں تحریکیں (نئی ضرورت کا احساس اور نقالی)
کام کر رہی ہیں۔ اور ان دونوں تحریکوں کے اچھے اور برے دونوں طرح کے عناصر بڑی
سرگرمی سے ادب پر اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ اس لئے مجموعی حیثیت سے' نئے ادب کے
متعلق صرف یہ کہہ دینا کہ وہ' اچھا ہے یا وہ برا ہے' صحیح نہیں۔ اس میں اچھی چیزیں ہیں اور
اچھی سے بھی زیادہ مقدار میں بہت اچھی' اسی طرح اس میں بری چیزیں ہیں اور ان بری چیزوں
سے کہیں زیادہ مقدار' بہت بری' چیزوں کی ہے۔ اس لئے اس' ادب' کو کلیتاً اچھا یا
کلیتاً برا کہنے سے پہلے بہت زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہے اور اس سوچ بچار سے زیادہ
اچھے اور برے کی پرکھ پیدا کرنے کی۔

مثلاً آپ نئے شاعروں پر' ان کی نئی شاعری پر ایک سرسری سی نظر ڈالئے نئے

شاعروں میں جو نام نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں اُن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔
راشد۔ فیض۔ مجاز اور ان سب میں زیادہ بدنام شاید میراجی۔ فیض اور مجاز نئے
شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں نئے عناصر کو پرانے عناصر میں سمو کر ایک ایسا
رنگ پیدا کر لیا گیا ہے جس سے اردو کا مزاج سرے سے ناآشنا نہیں۔ اور اس
طرح پرانے اور نئے عناصر کا یہ میل اردو شاعری کے تجربوں میں ایک ایسا اضافہ
ہے جو خوش گوار ہونے کے علاوہ مفید بھی ہے۔ راشد کی شاعری میں، ان دو شاعروں
کے مقابلے میں، نئے عناصر پرانے عناصر پر غالب ہیں۔ لیکن ان نئے عناصر میں ایک
خاص قسم کی توانائی ہے۔ اس لئے گو موجودہ صورت میں وہ خیال اور بیان کی دنیا میں
بعض جگہ بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جو شخص ادب کی ارتقائی منزلوں کے
تصور سے یہ سوچ سکتا ہو کہ کون سی ایسی چیز ہے جو آج نہ کبھی پسند کی جائے تو کل ضرور
پسند کی جائے گی، وہ دبی زبان ہی سے سہی، یہ کہنے میں تامل نہیں کرے گا کہ راشد کے
فنی تجربوں میں سے اکثر ایسے ہیں جو عروس شاعری کے جسم کے لئے جدید پیرہن بن
سکتے ہیں۔ لیکن میراجی کی نظمیں شاید اب سے دو تین نسل بعد کے پڑھنے والوں کے
لئے لکھی گئی ہیں اور اس لئے اردو پڑھنے والوں کو اس شاعر کی بلند پروازیوں سے
شکایت پیدا ہوتی ہے۔ پھر ان نئے شاعروں کے علاوہ سارے ہندوستان میں
اَن گنت نئے شاعر ہیں جن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی نیا تجربہ کر رہا ہے یا اس
نئے تجربے کے نام سے کوئی نہ کوئی ایسی "بدعت" جو شاید ہر آنے والے زمانے میں
فہم انسانی پر بوجھ ہی رہے گی۔

اسی طرح نیا افسانہ۔ اس میں سے رفتہ رفتہ پرانے عناصر سرے سے ختم ہی
ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ تحلیل نفسی، تحت الشعور کی نفسیات، نفسیات شباب
اور جنسی نفسیات نے لے لی ہے۔ اور زندگی کسی نہ کسی طرح کی نفسیات کا محور بن کر

رہ گئی ہے۔ نفسیات، انسانی فکر اور اس کے عمل کی سب سے بڑی محرک ہے اور اس علم
کا صحیح مذاق پیدا کر لینے کے بعد، ماہر نفسیات، طالب علم اور لیڈر، عاشق اور پولیس دونوں
کی ذہنی تحریک اور اُن کی عملی بنیاد کا پتہ آسانی سے لگا سکتا ہے۔ نفسیات اور زندگی کی
مادی چیزوں کا مطالعہ۔ یہ دو چیزیں ہیں جن پر نئے افسانے کی بنیاد ہے۔ اور اس میں شبہ
نہیں کہ ہمارے کئی افسانہ نگار۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری،
عصمت چغتائی، اختر انصاری۔ ان چیزوں کو سلیقہ سے برتنے پر قادر ہیں اور اس میں
شبہ نہیں کہ ان کی ادبی کوششوں نے اردو کے افسانوی سرمایہ کو پہلے سے کہیں زیادہ
وزنی، وقیع اور دلکش بنا دیا ہے لیکن ان سے کہیں زیادہ، ان گنت افسانہ نگار ایسے
ہیں جن کے نفسیات کا دائرہ عموماً صرف جنسی کرید کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ ان افسانہ
نگاروں کا مشاہدہ حسن کے ان اجزا پر سے پردہ اُٹھانے کو فن کی معراج سمجھتا ہے،
جن کا پردہ میں رہنا رومان انگیز بھی ہے، لطیف بھی اور حسن کا پردہ سے باہر آنا صرف
ذہنی تعیش اور کھوکھلی، سطحی لذتیت کی تلقین۔

یہی حال ادب کی دوسری اصناف کا بھی ہے۔ اور جب مجھ سے کوئی پوچھتا ہے
کہ تمہاری نظر میں نیا ادب کیسا ہے تو میں بڑی اُلجھن میں پڑ جاتا ہوں۔ جو بات
میرے ذہن میں آئینہ کی طرح صاف ہے۔ اُسے صاف صاف کہنے کے لئے لمبی چوڑی
تمہید اٹھانی پڑتی ہے۔ فن اور اخلاق کے کئی اصول گنوانے پڑتے ہیں، اور سنئے اور
پہلانے کا فرق بتانا پڑتا ہے۔ تب کہیں مشکل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئے ادب میں جو کچھ
اچھا ہے وہ واقعی بہت اچھا ہے اور جو کچھ بُرا ہے وہ بہت بُرا۔ اور اس لئے نئے ادب
کے سکوں کو بیں نکرا کہہ دینے میں بھی ہمارا نقصان ہے۔ اور سرے سے کھوٹا کہہ دینے
میں بھی ہمارا ہی نقصان۔ جنہوں نے ادب کے بازار میں نئے سے نئے چمکدار اور
سریلی جھنکار پیدا کرنے والے سکے چلائے ہیں، ہم اُن کی کوششوں کو سراہتے ہیں،

اُن کے احسان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور جنہوں نے ان نئے سکوں کے نام اور چلن سے فائدہ اٹھا کر سارے بازار میں کھوٹے ہی کھوٹے سکے بکھیر دیئے ہیں۔ اُن سے ہم سخت بیزار ہیں، اب یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ نئے ادب کی آڑ میں کھوٹے سکے' بازار میں کھرے سکوں سے زیادہ چلنے لگے ہیں۔ لیکن ان کا دھوکا کھلتا جا رہا ہے اور وقت جس میں ان سکوں کی پرکھ سب سے زیادہ ہے، انہیں مٹا کر رکھ دے گا اور پھر شاید ایک بار پھر ہمارا ادب ہمارا تمدن اور ہمارا اخلاق ان جیاسوز بلاؤں سے محفوظ ہو جائے گا۔

میں شاید یہ سب کچھ جذبات کی رو میں کہہ گیا ہوں۔ لیکن یہ بات ہی ایسی ہے کہ آدمی کو مجبوراً جذباتی بنا دیتی ہے۔ اپنے بزرگوں کی صدیوں کی محنت اور جانفشانی سے کمائی ہوئی دولت کو اس طرح لٹتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ کیا واقعی ہمیں نئے ادب کے متعلق کچھ کہنے کا حق پیدا ہو گیا ہے۔ کیا وہ منزل آگئی ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے اُس پر کچھ کہا بھی جائے۔ مجھے اس میں شبہ بھی ہے اور پس و پیش بھی۔ اور اس پس و پیش کی ذمہ داری مجھ سے زیادہ خود نیا ادب' پیدا کرنے والوں پر ہے۔ وہ ایک نئی ضرورت کو محسوس کر کے ادب میں نئی راہیں نکال رہے ہیں' نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ان نئی راہوں میں یقیناً بہت کم ایسی بن سکی ہیں کہ آدمی آنکھیں بند کر کے' ٹھوکریں کھائے بغیر' ان پر چل سکے۔ اور ان تجربوں میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں جس نے آخری شکل اختیار کر لی ہو یا جس کے متعلق یہ سوچا جا سکے کہ یہ حرفِ آخر ہے۔ راہیں اندھیری ہیں اور تجربے نارس۔ ابھی ان راہوں کو روشن بننا ہے۔ تجربوں کو پختہ بننا ہے۔ اور راہوں کے روشن کرنے اور تجربوں کے پختہ بنانے سے نہ جانے کتنی راہیں بدلنی پڑتی ہیں اور کتنے تجربوں کو ٹھکرانا پڑتا ہے۔ راہیں بدلی جا رہی ہیں' تجربے ٹھکرائے جا رہے ہیں۔ اور ان نت نئی راہوں پر چلنے والے اور نت نئے تجربے کرنے والے خود شبہ میں ہیں کہ آئندہ کون سی راہ چلنی ہے اور کون

سی راہ ایسی ہے جو انہیں اور اُن کے پیدا کئے ہوئے ادب کو صحیح منزل کی طرف لے جائے۔

ادب کے بحرانی دور میں دونوں باتوں میں خطرہ ہے۔ اچھا کہنے میں بھی اور بُرا کہنے میں بھی۔ دونوں چیزیں دھوکے میں ڈالتی ہیں۔ ایک پڑھنے والوں کو دوسری لکھنے والوں کو۔ ایک سے پڑھنے والوں میں قدروں کا غلط معیار پیدا ہو جاتا ہے، دوسری سے لکھنے والوں کا دل دکھتا ہے۔ اور اسی لئے جب میں نئے ادب کے متعلق کچھ کہتا ہوں تو اس کے دو الگ الگ حصے کرنے پڑتے ہیں۔ اور پھر دونوں میں سے ایک کو سراہنا اور دوسرے سے بیزاری کا اظہار۔

پہلا حصہ بھی ایسا ہے جس پر مغرب نے اثر کیا ہے اور دوسرا حصہ بھی۔ پہلے میں مغرب کے اچھے عناصر ہیں اور دوسرے میں بُرے عناصر۔ ایک طرف روس کا معاشی نظریہ اور زندگی کی سچی مصوری۔ اور دوسری طرف لارنس اور جوائس کا بیباک فن۔ آڈن اور اسپنڈر (Auden & Spender) کا ابہام اور ان دونوں سے کہیں زیادہ مضر اور خطرناک، فرائڈ کی جنسیات۔ اور دل یہ چاہتا ہے کہ ادب دوسروں کا نہیں، اپنا بن کر رہے۔ اس کے پائے نظر میں آزادی ہو۔ لیکن اپنی فطرت کی توہین نہ ہو۔

مشعل راہ

تخشب جارچوی کا مجموعۂ کلام

تخشب اُن جوان لکھنے والوں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اسی شدّت سے محسوس کیا ہے۔

حسرت موہانی کے بعد غزل کے میدان میں تخشب نے جو کامیابی حاصل کی ہے۔ تخشب کے دیگر ہم عصروں میں اس کا بہت ہلکا رنگ ملتا ہے غزل اور نظم میں تخشب نے ایک ایسی راہ ڈھالی ہے جو صرف انہی کے لئے ہے۔ بقول جوش ملیح آبادی" ان کی شاعری بھی ان کی طرح جوان ہے۔ ان کے بیان میں تازگی اور لہجے میں شیرینی کا عنصر بہت خوبی کے ساتھ سمویا ہوا ہے" قیمت مجلّد تین روپے ۸ آنے

تلخیاں

رشید اختر ندوی کا تازہ ناول

ظالم۔ بے حس۔ اور تنگ نظر سماج پر یہ ناول ایک شدید ترین ضرب ہے۔ سارا ناول ہوس کے جال میں جکڑا ہوا ہے مگر اتنے مہذب پیرائے میں لکھا گیا ہے جس سے مغربی دھوون پینے والوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ غالب کے اس مصرع کی شرح ۳۵۲ صفحات میں کی گئی ہے" ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا" اس ناول میں تلخیاں ہی تلخیاں ہیں۔ مگر اس کڑواہٹ اور زہر کے پردے میں حقیقی امرت کے دھارے بھی آپ کو ملیں گے۔ محبت کا بلند معیار۔ غریب کی بے قیمت عصمت، سماج کے اندھے قانون ظلم کی ہمہ گیری، دنیا کیا ہے یہ آپ کو اس ناول کے پڑھنے کے بعد محسوس ہوگا۔ قیمت تین روپے۔

نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی

نغمے کی موت

کرشن چندر کے نئے افسانوں کا مجموعہ

کرشن چندر ہندوستان کے ایسے لکھنے والوں میں سے ہیں جن پر نئے ادب کو بجا طور پر ناز ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں وہی لکھ لیتے ہیں زندگی کی تلخیاں بھی اس میں ملیں گی۔ اور شبنم آمیز لطیف احساسات بھی۔ ان افسانوں میں روح کا زہر بھی نظر آئے گا اور آب حیات بھی انسانی زندگی کے جو نقوش آپ کو ان افسانوں میں ملیں گے وہ آپ کو کرشن چندر کے دیگر شہ پاروں میں نظر نہیں آئیں گے۔ اگر آپ جنت و جہنم کو ایک مقام پر سانس لیتے ہوئے دیکھنا چاہیں تو نغمے کی موت کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت دو روپے چار آنے۔

اعمال نامہ

سر سید رضا علی ایم۔ ایل۔ اے کی خود نوشت سوانح حیات

ہندوستان کے ہر ادبی ادارے کے ترجمان نے اس کتاب کو سلکہ کی بہترین تصنیف مانا ہے۔ اس میں نہ صرف سر رضا علی نے اپنے حالات لکھے ہیں بلکہ یہ ہندوستان کی سو سالہ تاریخ بھی جا سکتی ہے۔ سیاست شعر و شاعری، اخلاقیات، تنقید، معلومات، غرضکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا گیا جس پر سر رضا علی نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ زبان و بیان کی مثال موجودہ دور میں ہرگز ہرگز کہیں نہیں مل سکتی یہ صرف سوانح حیات نہیں ہے بلکہ اب سے سو سال کی ہندوستانی زندگی کی بے نقاب تصویر ہے۔ جس کے پڑھنے کے بعد کوئی بھی کتاب منظر و دل اور دماغ کے لئے نیا پیام نہیں دیتی۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلّی!